345 مارچ ۲۰۱۱ء

مدیر اعلیٰ
حافظ عبدالرحمن مدنی
حفظہ اللہ

مدیر
ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

ملّتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلّہ

محدث

۲ امریکی نمک خوار، حقائق اور بھید؟
۱۱ کیا صفاتِ الٰہیہ میں ائمہ ربعہ مفوضہ ہیں؟
۵۲ عہد رسالت اور سائنس وٹیکنالوجی

مجلس التحقیق الاسلامی
ISLAMIC RESEARCH COUNCIL
PAKISTAN
مجلس التحقیق الاسلامی

ماہنامہ محدث لاہور

ماہنامہ 'محدث' لاہور کا اجمالی تعارُف

مُدیرِ اعلیٰ: حافظ عبدالرحمٰن مدنی **مُدیر:** ڈاکٹر حافظ حسن مدنی

ماہنامہ 'محدث' لاہور، ہندوستان سے نکلنے والے ایک رسالے کی ہی ارتقائی شکل ہے۔ جامعہ رحمانیہ دہلی سے نکلنے والے رسالے - جس کا نام محدث تھا- کو پروان چڑھاتے ہوئے تقسیمِ ہند کے بعد دوبارہ ماہنامہ 'محدث' لاہور کے نام سے پاکستان میں معروف عالم دین ودانشور حافظ عبدالرحمٰن مدنی حفظہ اللہ نے اس کا اِجراء کیا۔ یہ تحقیقی رسالہ ۱۹۷۰ء سے اب تک کامیابی وکامرانی سے شائع ہورہا ہے، وللہ الحمد!

محدث کی علمی پہچان کے حوالے سے اتنا ہی کافی ہے کہ یہ ہر صاحبِ علم وفضل کی ضرورت بن چکا ہے کیونکہ اس کے مضامین جدید فکر کے حامل اور ملحدانہ افکار کیلئے شمشیر بے نیام کی حیثیت رکھتے ہیں۔

گھر بیٹھے 'محدث' وصول کیجئے!

قارئین کرام! گھر بیٹھے محدث حاصل کرنے کیلئے درج ذیل طریقہ کار اختیار کریں!

فی شمارہ: ۲۰روپے **زرِ سالانہ:** ۲۰۰روپے **بیرون ملک:** ۲۰ڈالر

بذریعہ منی آرڈر/بینک ڈرافٹ ۲۰۰روپے بھیج کر سال بھر گھر بیٹھے محدث وصول کریں اور علمی وتحقیقی مضامین سے استفادہ کریں۔ **ایڈریس:** ماہنامہ محدث، ۹۹جے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۵۴۷۰۰

فون نمبر: 35866476 / 042 - 3586639 **موبائل:** 0305 - 4600861

انٹرنیٹ پر محدث پڑھنے اور ڈاؤن لوڈ کرنے کیلئے درج ذیل ویب سائٹ دیکھئے!

www.kitabosunnat.com __ www.mohaddis.com

مزید تفصیلات کیلئے: webmaster@kitabosunnat.com

اجرائے مُحدث کے مقاصد

- عناد اور تعصّب قوم کیلئے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں!
لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کیلئے رحمت کا باعث ہے۔

- علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں!
لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دَقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

- غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے!
لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سر انجام نہ دینا حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

- تبلیغ دین اور اشاعت اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالح دینیہ کے خلاف ہے!
لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین و مسائل اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

- آئین و سیاست سے بیگانہ ہر کر عبادت کیلئے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے!
لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی۔

- جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے!
لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ محدث لاہور

کا مطالعہ فرمائیے، آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزین پائیں گے، ان شاء اللہ!
کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

ملّتِ اسلامیہ کا علمی و اصلاحی مجلّہ

ماہنامہ محدّث لاہور پاکستان

مدیرِ اعلیٰ
حافظ عبدالرحمن مدنی

مدیر
ڈاکٹر حافظ حسن مدنی
Only For SMS
0333-4213525

جلد ۴۳ / شمارہ ۳ —— ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ —— مارچ ۲۰۱۱ء

مدیر معاون
کامران طاہر
0302 4424736

زرِ سالانہ
۲۰۰/= روپے
فی شمارہ ۲۰/= روپے

بیرونِ ملک
زرِ سالانہ ۲۰/= ڈالر
فی شمارہ ۲/= ڈالر

Monthly MUHADDIS A/c No: 984-

UBL- Model Town
Bank Squre Market, Lahore

دفتر کا پتہ
۹۹ جے، ماڈل ٹاؤن
لاہور 54700

042-35866476
35866396
35839404

Email:
mkamratahir@gmail.com

Publisher:
Hafiz Abdul Rahman Madani

Printer:
Shirkat Printing Press, Lahore

فہرست مضامین

فکر و نظر

امریکی نمک خوار؛ حقائق اور بھید؟ ۲

ایمان و عقائد

کیا صفاتِ الٰہیہ میں ائمہ اربعہ 'مفوضہ' ہیں؟ — حافظ محمد زبیر ۱۱

تحقیق و تنقید

کیا نبی اکرم ﷺ کی نمازِ جنازہ ہوئی تھی؟ — فاروق رفیع ۳۹

نقطۂ نظر

عہدِ رسالت اور سائنس و ٹیکنالوجی — ڈاکٹر نعمان ندوی ۵۲

مکاتیب

قارئین کے تبصرے اور تاثرات ۷۵

تعارفِ کتب

کتاب 'برصغیر کا اسلامی ادب' — طاہر الاسلام ۷۹

Islamic Research Council

...ث کتاب و سُنّت کی روشنی میں آزادانہ بحث و تحقیق کا حامی ہے ادارہ کا مضمون نگار حضرات سے کُلّی اتّفاق ضروری نہیں!

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فکر و نظر

امریکی نمک خوار، حقائق اور بھید؟

امریکی 'نمک خواروں' کے ایک مخصوص ٹولے کے بس میں نہیں کہ کس طرح فوری طور پر دو پاکستانیوں کے قاتل ریمنڈ ڈیوس کو امریکا کے حوالے کر دیا جائے۔ بے غیرتی کی موٹی کھال اوڑھے ہوئے یہ طبقہ کس طور امریکا کو ناراض کرنے کے لیے تیار نہیں اور پاکستانی قوم اور حکومت سے یہ توقع رکھتا ہے کہ چاہے قانون جو مرضی کہے، جرم کتنا سنگین کیوں نہ ہو اور عدالتیں خواہ جو مرضی کہیں پاکستان کو ہر حال میں امریکی قاتل کو فوری امریکا کے حوالے کر دینا چاہیے۔ ہمیں ڈراوا دیا جارہا ہے کہ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو امریکا ہماری امداد بند کر دے گا اور ہمارا جینا دوبھر ہو جائے گا۔ ابھی تک خود امریکا ریمنڈ ڈیوس کے معاملے میں کئی پینترے بدل چکا ہے مگر امریکا کے یہ نمک خوار پاکستانی اس بات پر بضد ہیں کہ امریکی قاتل کو سفارتی استثنیٰ حاصل ہے!

یہاں سابق وزیر خارجہ شاہ محمود قریشی نے اُصول، انصاف اور قومی حرمت کی خاطر اپنی وزارت کو قربان کرتے ہوئے اس معاملہ پر واشگاف انداز میں امریکا کو بتا دیا ہے کہ اُن کی خواہش پر ریمنڈ ڈیوس کو نہیں چھوڑا جاسکتا۔ یہاں امریکا نے خود بارہا کہا کہ ڈیوس لاہور میں امریکی قونصلیٹ کا ممبر ہے۔ امریکہ کے اس اعتراف/موقف کی بنیاد پر اگر وہ سفارتکار ثابت بھی ہوتا ہے تو اس کے باوجود اس کو دو افراد کے قتل کے مقدمے میں استثنیٰ نہیں دیا جاسکتا۔ یہاں یہ بھی واضح ہے کہ سفارتکاری کی تاریخ میں اور ویانا کنونشن کے بعد یہ پہلا واقعہ ہے جہاں ایک 'سفارتکار' (اگر ریمنڈ ڈیوس کو ایک لمحہ کے لیے سفارتکار مان بھی لیا جائے) نے اس انداز میں دو افراد کو قتل کیا کہ جس کی تاریخ میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ یہاں یہ بھی ثابت ہو چکا کہ پنجاب پولیس کو تفتیش کے دوران ریمنڈ ڈیوس نے اپنے آپ کو لاہور قونصلیٹ میں

تعینات بتایا۔ یہاں یہ بھی سامنے آچکا کہ ڈیوس نے اپنے بچاؤ کے لیے نہیں بلکہ طیش میں انتہائی بے دردی سے دو پاکستانیوں کے خون سے ہاتھ رنگا جبکہ اس کی مدد کے لیے آنے والی گاڑی نے ایک اور نوجوان کو روند ڈالا۔ اس سب کے باوجود امریکی 'نمک خواروں' کا یہ حال ہے کہ امریکا کی وکالت کرتے نہیں تھکتے اور قومی غیرت کا مظاہرہ کرنے والوں کو جذباتی اور کم عقل سمجھتے ہیں!!

ویانا کنونشن 1963ء کے مطابق قونصلیٹ کے کسی بھی عہدیدار، چاہے وہ اعلیٰ ترین سفارتکار ہو، کو قتل جیسے سنگین جرم میں سفارتی استثنیٰ نہیں دیا جاسکتا مگر امریکا کے نمک خواروں کی یہ حالت ہے کہ وہ کسی منطق کو مانتے ہیں اور نہ کوئی دلیل سننے کے لیے تیار ہیں۔ وہ تو ہر صورت میں قاتل امریکی کو امریکا کے حوالے کرنے کا راگ الاپ رہے ہیں۔ وزارتِ خارجہ کے ریکارڈ میں ڈیوس ایک سفارتکار یا ایمبیسی کے اہلکار کے طور پر رجسٹرڈ نہ تھا اور نہ ہی اس کو وزارت خارجہ کا ڈپلومیٹک شناختی کارڈ دیا گیا۔ اس دہرے قتل کے بعد اب یہ وزارت سخت دباؤ کا شکار ہے کہ ڈیوس کو ایمبیسی کا سفارتکار دکھا کر اس کو ایک ایسے سنگین جرم میں استثنیٰ دیا جائے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی اور جس کی وجہ سے تین جانیں ضائع ہوئیں۔

امریکی ویزے، ڈالروں کے بدلے اور کچھ اپنے دوسرے شوق کی خاطر ملک و قوم کی عزت کا سودا کرنے والے تو کچھ سمجھنے سے قاصر ہیں، اس لیے میں یہاں عام قارئین کی خدمت میں کچھ حقائق پیش کر رہا ہوں:

① ریمنڈ کے اپنے بیان کے مطابق وہ لاہور قونصلیٹ میں تعینات تھا۔ تفتیشی حکام نے اس سے بارہا اس بات کی تصدیق کی۔ منظر عام پر آنے والی ایک ویڈیو میں تو تفتیش کا عمل شروع ہونے سے پہلے جونیئر پولیس آفیسر نے اُس سے یہاں تک پوچھا کہ ''آیا تم امریکی ایمبیسی میں تعینات ہو؟'' تو ریمنڈ نے واضح طور پر کہا: نہیں، میں امریکی قونصلیٹ لاہور میں تعینات ہوں۔

② لاہور قونصلیٹ کے حکام نے باقاعدہ جاری کی گئی ریلیز میں عین وقوعہ کے دن ریمنڈ

ڈیوس کو قونصلیٹ کا ملازم قرار دیا۔

③ قونصلیٹ میں تعینات کسی بھی عہدیدار کے لیے بھی Vienna Convention on Diplomatic Relations 1961 لاگو نہیں ہوتا۔ جبکہ قونصلیٹ میں کام کرنے والے اہلکاروں کے لیے Vienna Convention on Consulor Relation 1963 لاگو ہوتا ہے جس کے آرٹیکل 41(1) کے تحت قونصلیٹ کے کسی بھی رکن کو قتل جیسے سنگین جرائم پر استثنیٰ حاصل نہیں ہے۔

④ یہ صورتِ حال واضح ہونے کے بعد واقعے کے تیسرے روز امریکی سفارت خانے نے باقاعدہ پریس ریلیز کے ذریعہ یہ 'وضاحت' کی کہ ریمنڈ 'دراصل' اسلام آباد کی امریکی ایمبیسی میں تعینات تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ بیان اس لیے جاری کیا گیا کہ کس طریقے سے ریمنڈ کے کیس پر 1961ء کا سفارتی تعلقات کا ویانا کنونشن نافذ ہو۔ دوسری طرف محترم شاہ محمود قریشی نے تصدیق کردی کہ واقعے کے اگلے روز 28/جنوری 2011ء کو امریکی سفارت خانے نے حکومتِ پاکستان کو باقاعدہ خط میں ریمنڈ کا نام سفارت خانے کے ملازمین میں شامل کرنے کا نوٹیفکیشن جاری کرنے کا کہا جس سے جھوٹ کا بھانڈا پھوٹ گیا۔ کیونکہ 25 جنوری کو جاری کی جانے والی فہرست میں ریمنڈ کا نام شامل نہیں تھا۔

⑤ ریمنڈ کے بیان، امریکی اہلکاروں کی تصدیق کہ ریمنڈ قونصلیٹ کا رکن ہے اور جناب شاہ محمود قریشی کے انکشافات نے یہ واضح کردیا کہ ریمنڈ پر Vienna Convention 1963 لاگو ہوگا اور اسے اسی کنونشن کے آرٹیکل 41(1) کے تحت استثنیٰ حاصل نہیں ہے، کیونکہ اس کا جرم سنگین نوعیت کا ہے۔

⑥ اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ Vienna Convention on Diplomatic Relation 1961 کو ریمنڈ کو مکمل سفارتی استثنیٰ کے حوالے سے نافذ کیا جائے تاکہ امریکا خوش ہوجائے تو اس معاملہ میں اس کنونشن کا آرٹیکل 10(1) اہم ہے۔ اس آرٹیکل کی روشنی میں سفارتکار بھیجنے والے ملک کا یہ استحقاق ہے کہ وہ اپنے کسی اہلکار کے لیے خصوصی استثنیٰ کا مطالبہ کرے مگر یہ بھی

حقیقت ہے کہ صرف اور صرف میزبان ملک کی وزارتِ خارجہ ہی اس Status کو کنفرم کرسکتی ہے اور سب سے اہم یہ کہ 1961ء کے سفارتی تعلقات ویانا کے کنونشن کے تحت استثنیٰ کا دعویٰ صرف اس صورت میں کیا جاسکتا ہے، جب اس کنونشن کے آرٹیکل 10(1) کے تحت ایسے سفارت کار یا اہلکار کو میزبان ملک کی وزارتِ خارجہ باقاعدہ notify کردے۔ امریکا میں تو باقاعدہ دفتر خارجہ سفارتی کارڈ جاری کرتا ہے جن پر اگر استثنیٰ ہو تو اس حوالے سے تصدیق بھی درج ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں امریکی دفتر خارجہ کا ستمبر 2010ء کا جاری کردہ کتابچہ دیکھا جاسکتا ہے جس میں قانون نافذ کرنے والے اداروں کو واضح ہدایت دی گئی ہے کہ جن سفارتکاروں کے پاس یہ کارڈ نہ ہو یا کارڈ کے اوپر استثنیٰ کے حوالے سے واضح ہدایات درج نہ ہوں، اُنہیں کسی بھی صورت کسی بھی جرم کے حوالے سے استثنیٰ نہ دیا جائے بلکہ یہاں تک درج ہے کہ ایسا کارڈ موجود ہونے اور اس پر استثنیٰ کے واضح اندراج کے باوجود یہ ضروری ہے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے متعلقہ اہلکار دفتر خارجہ کو فون کرکے باقاعدہ تصدیق کردیں گے غرض ویانا کنونشن کے تحت حاصل استثنیٰ میزبان ملک کی وزارت خارجہ کو Notify کرنے سے منسلک ہے۔

⑦ 1961 کے اسی ویانا کنونشن کے استثنیٰ کے لیے اہلیت کی شرائط بھی موجود ہیں۔ واقعے کے تیسرے ہی دن امریکی دفتر خارجہ نے سرکاری طور پر کہا کہ امریکی قاتل کا نام 'ریمنڈ ڈیوس' نہیں ہے۔ آج کے دن تک اس سرکاری بیان کی تردید نہیں کی گئی۔ قریشی صاحب تصدیق کرچکے ہیں کہ ریمنڈ کی استثنیٰ کی درخواست پاکستانی وزارتِ خارجہ نے آج تک notify نہیں کی۔ فرض کریں کہ ایسا کر بھی دیا گیا ہوتا تب بھی جب امریکی حکومت سرکاری طور پر اعلان کررہی ہے کہ اس شخص کا نام ریمنڈ نہیں تو استثنیٰ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، کیونکہ ویانا کنونشن کے تحت جس شخص کو بھی استثنیٰ حاصل ہوگا، اس کے نام سے میزبان ملک کی وزارتِ خارجہ کا نوٹیفیکیشن جاری ہونا ضروری ہے۔

⑧ پاکستان کو یقیناً ایک ذمہ دار ملک کی طرح بین الاقوامی قوانین کا احترام کرنا چاہیئے مگر ایک خود مختار ملک ہونے کے ناطے کسی طاقتور ملک کی دھونس دھمکیوں میں آکر ویانا کنونشن کی غلط تشریحات بھی قبول نہیں کی جاسکتیں۔ اگر ریمنڈ کو استثنیٰ حاصل ہوتا بھی تب بھی پاکستان کو ویانا کنونشن کے آرٹیکل 32 کے تحت امریکا سے یہ استثنیٰ واپس لینے کی درخواست کرنی چاہیے تھی کیونکہ ریمنڈ انتہائی خطرناک نوعیت کی مجرمانہ کارروائی میں ملوث پایا گیا ہے۔

⑨ ویانا کنونشن کے آرٹیکل 41 کے مطابق یہ ہر سفارتکار کی ذمہ داری ہے کہ وہ میزبان ملک کے قوانین کا احترام کرے۔ کیا ریمنڈ نے ایسا کیا....؟

⑩ امریکی دفتر خارجہ کی اپنی دستاویز کے مطابق:

"It should be emphasized that even at its highest leval, diplomatic immunity does not exempt diplomatic offecers from obligation of conforming with national and local laws and regulations. Diplomatic immunity is not intended to serve as license for persons to flout the law and purposely avoid liability for their actions. The purpose of these privileges and immunities is not to benefit but to ensure the efficient and effective performance of their official on behalf of their government."

حقیقت یہ ہے کہ ایک طبقہ ہمیں امریکا کی غلامی سے آزاد نہیں دیکھنا چاہتا۔ ان کی کوشش یہ ہے کہ جس طرح ماضی میں اور کاص طور پر مشرف دور میں پاکستانیوں اور دوسرے ممالک کے مسلمانوں کو امریکا کے حوالے کیا جاتا رہا اور امریکا کی مرضی کے مطابق یہاں سب کچھ کیا جاتا رہا، وہ سلسلہ اسی انداز میں جاری رہے۔ کوئی امریکا سے پوچھنے والا نہیں کہ مشرف دور میں 1961ء کے اسی ویانا کنونشن کے آرٹیکل 39، 44، 45 کی کس کس نے دھجیاں اُڑائیں، جب 2001ء میں پاکستان میں افغانستان کے سفیر ملا ضعیف کو شدید تشدد کے بعد پاکستان کے فوجی حکمرانوں نے امریکیوں کے حوالے کیا تھا۔ ملا ضعیف کی زبانی سنائی گئی کہانی کے بعد کم از کم امریکیوں اور اُن کے مشرف جیسے پاکستانی حواریوں کو 'ویانا کنونشن' کا نام لیتے ہوئے بھی شرم آنی چاہیے۔

1961ء کے ویانا کنونشن کا ابتدائیہ اور آرٹیکل 41(1) پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس کنونشن کا مقصد ہر گز ہر گز مجرموں اور جاسوسوں کا تحفظ نہیں تھا۔ امریکا کے حمایتیوں کا کہنا ہے کہ ہم نے بین الاقوامی معاہدہ کیا ہوا ہے اور اگر ہم نے ریمنڈ کو امریکا کے حوالے نہ کیا تو پاکستان کے ساتھ بہت بُرا ہوگا۔ وہ کہتے ہیں ریمنڈ کو تو نارمل استثنیٰ حاصل ہے اور یہ کہ استثنیٰ کے بارے میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی۔

یہ دھمکی بھی دی جاتی ہے کہ امریکا بہت طاقتور ملک ہے، سپر پاور ہے۔ پاکستان بہت کمزور ملک ہے۔ پاکستان کی معیشت انتہائی کمزور ہے۔ پاکستان ریمنڈ کو حوالے نہ کرکے امریکی امداد سے ہاتھ دھو بیٹھے گا اور کسی بھی طور پر اپنی معیشت صحیح نہیں کرسکے گا، لیکن میرا سوال امریکی غلاموں سے یہی ہے کہ کیا غریب کی کوئی عزت نہیں ہوتی؟ کیا ایک کمزور ملک اپنی خود مختاری کو برقرار نہیں رکھ سکتا؟ کیا قرضے کے عوض اپنے گھر کے دروازے غیروں اور طاقتور غنڈوں کے لیے کھول دیئے جاتے ہیں؟ اگر ریمنڈ کے قتل کو ویانا کنونشن کی آڑ میں چھوٹ دے دی جائے تو کیا یہ ملک کے لیے آسان نہ ہوجائے گا کہ وہ اپنے دشمن ممالک میں اپنے سفارتکاروں کے ذریعے قتل وغارت کرادیں؟

['کس سے منصفی چاہیں؟' انصار عباسی، 14/فروری 2011ء]

(2) گہرا تاریک راز

دریا کی لہروں کے خلاف کب کون تیر سکا ہے؟ تاریخ میں جب طوفان اُٹھتے ہیں تو تنکے راہ نہیں روکتے! لاہور کا سانحہ تو بہت اذیت ناک ہے کہ شمائلہ سمیت چار زندگیاں چلی گئیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اپنے انجام میں، لیکن یہ محض ایک المیہ نہ رہے گا۔

رنگ لائے گا لہو! پے در پے واقعات میں جن کا سان گمان تک نہ تھا، قدرت کے اشارے ہیں۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ایک جواں سال خاتون جس کے سامنے پوری زندگی پڑی تھی، اس طرح جان ہارے گی کہ باقی رہنے والی ایک حیران کن داستان وجود پائے گی۔ اس کی موت ہمیشہ یاد دلاتی رہے گی کہ اللہ کے نام پر وجود میں آنے والے ملک کی اشرافیہ کس قدر

سفاک تھی! استعمار سے ایسا گٹھ جوڑ اُس نے کر رکھا تھا کہ کتنا ہی سنگین سانحہ ہو، کسی کو انصاف کی اُمید نہ تھی! کون کہہ سکتا تھا کہ شاہ محمود قریشی ایسا آدمی جس کے اَجداد نے 1857ء میں ڈٹ کر انگریزوں کا ساتھ دیا اور احمد خان کھرل کے قتل میں شریک تھا، روٹھ کر وزارت ٹھکرا دے گا !!

استعمار اور اس کے پاکستانی کارندوں کے مقابل ہمیں سب سے زیادہ غیر متوقع اعانت مغربی اخبارات سے ملی۔ ملک میں تو ورنہ ایسے دانشور بھی کارفرما تھے جو حقیقت کو افسانہ اور افسانے کو حقیقت ثابت کرنے پر تلے تھے۔ ایسے شدومد کے ساتھ کہ دانش دیکھتی اور حیران ہوتی اور حیامنہ چھپاتی تھی۔ بقول جوش ؏

بدی کرتا ہے دشمن اور ہم شرمائے جاتے ہیں!

لندن کے معتبر اخبار 'گارجین' کے بعد 'واشنگٹن پوسٹ' نے بھی تصدیق کر دی کہ ریمنڈ ڈیوس سی آئی اے کا ایجنٹ ہے۔ وقائع نگار Declan Walsh کا جملہ یہ ہے:

Based On interviews in the US and Pakistan, the Guardian can confirm the 36 years old former special force soldier is employed by CIA.

''پاکستان اور امریکہ میں (باخبر افراد سے) ملاقاتوں کی بنا پر گارجین اس امر کی تصدیق کر سکتا ہے کہ سپیشل امریکی فورس کے 36 سالہ سابق ملازم کی خدمات اب سی آئی اے کو حاصل تھیں۔''

ممکن ہے انکل سام کا کوئی پاکستانی کارندہ توجیہ کرنے کی کوشش کرے کہ محض ملاقاتوں سے نتیجہ اخذ نہ کرنا چاہیے۔ دو باتیں مگر بے حد اہم ہیں: اوّل کہ صرف ذاتی نہیں اخبار نویس نے ادارے کی طرف سے ذمہ داری قبول کی ہے۔ ثانیاً جن اہم لوگوں سے وہ ملا ان میں ممتاز امریکی شامل ہیں۔ واشنگٹن پوسٹ کے مطابق '' وہ لاہور میں سی آئی اے کی ٹیم کا حصہ تھا جو اس شہر میں محفوظ ٹھکانے سے اپنی سرگرمیاں انجام دے رہی تھی۔'' کیا یہ محفوظ ٹھکانہ لاہور کا قونصل خانہ ہے یا کوئی اور؟ وزیر قانون رانا ثناءاللہ کو وضاحت کرنی چاہیے۔ قومی تاریخ کے اس نازک موڑ پر رانا صاحب نے غیر معمولی جرات کے علاوہ جس کی اُمید کی جاتی ہے، حیران کن دانائی سے کام لیا جس کی توقع نہ کی جاتی تھی۔ تجربات سے آدمی سیکھتے ہیں او

ربحرانوں میں اُن کے جوہر کھلتے ہیں۔ تاہم وزیر اعلیٰ شہباز شریف کے پختہ فیصلے کے بغیر یہ ممکن نہ ہوتا۔ ایک حکمران کی ستائش پر طعنے سننا پڑتے ہیں مگر کیا کیجئے ستارے کو ستارہ اور بادل کو بادل ہی کہنا ہوتا ہے۔

اگر کبھی جناب رحمٰن ملک بھی ایسا کوئی موقع ارزاں فرمائیں؟ وزیر داخلہ اور اُن کے سرپرست اُلجھ گئے۔ ایک تاریخی موقع اُنہوں نے گنوا دیا۔ یہ بات طے کرنے کے لئے کہ کیا ریمنڈ ڈیوس ایک سفارت کار ہے؟ زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹہ درکار تھا۔ چار ہفتوں میں وہ فیصلہ نہ کر سکی۔ پنجابی محاورے کے مطابق سونے والے جگایا جاسکتا ہے مگر جاگتے کو کبھی نہیں۔ صدر زرداری اور ان کے ساتھیوں نے تہیہ کر رکھا ہے کہ امریکہ کے معاملے میں وہ سیاہ کو کبھی سیاہ نہ کہیں گے۔ وزیر اعظم گیلانی نے ارشاد کیا کہ وہ لاہور کے سانحہ کی مذمت کرتے ہیں۔ مذمت تو وہ ڈرون حملوں کی بھی کیا کرتے ہیں، لیکن ان کا اصل موقف کیا ہے؟ وکی لیکس کے طفیل سبھی جانتے ہیں!

کتنا دباؤ ہے، کس قدر شدید امریکی دباؤ کہ وزارتِ خارجہ مہلت پہ مہلت مانگ رہی ہے۔ سچائی آشکار ہے اور اتنی آشکار کہ شاہ محمود جیسا شخص بھی انحراف نہ کر سکا۔ ریمنڈ ڈیوس محض ایک قاتل اور جاسوس نہیں۔ معاملہ بہت پیچیدہ ہے ورنہ ذوالفقار مرزا کے ذریعے فساد کھڑا کرنے کی کوشش نہ کی جاتی۔ مرزا کی بدن بولی (باڈی لینگویج) ان کے الفاظ سے ہم آہنگ نہ تھی۔ دس نکاتی مذاکرات سے اُن کا کوئی تعلق نہ تھا۔ جس مقام پر اُنہوں نے خطاب فرمایا وہاں اس موضوع پر اظہارِ خیال ہی تعجب خیز ہے۔ دو دن قبل وہ ایم کیو ایم کے سامنے سر جھکا کر آئے تھے۔ یہ دن سازگار نہ تھا کہ وہ شعلہ بیانی کرتے۔ اس کے باوجود اُنہوں نے خود کو داؤ پر لگا دیا۔ کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؛

کچھ نہیں بہت کچھ...! افغانستان میں امریکی شہری آئے دن اغوا ہوتے ہیں اور دوسرے مضطرب ممالک میں بھی۔ امریکی قیادت حرکت میں ضرور آتی ہے، لیکن اس قدر پریشان تو وہ کبھی نہ تھی۔ نہ صرف ہیلری آگ بگولہ ہوئیں بلکہ صدر اوباما نے بھی خود کو جھونک دیا۔ دلچسپ ترین یہ ہے کہ دونوں نے کوئی دلیل نہ دی، فقط شور مچایا۔ واشنگٹن میں پاکستانی

سفارت خانہ بند کرنے اور امریکی امداد روک دینے کی افواہیں پھیلائی گئیں۔ بظاہر کیسے معتبر افراد اور اداروں کے ذریعے، آخر کیوں؟ کیا ریمنڈ ڈیوس کے پاس کوئی گہرا تاریک راز ہے جس کے آشکار ہو جانے کا خوف امریکی انتظامیہ کے اعصاب پر سوار ہے۔ کوئی ایسا گورکھ دھندا جو پاکستانی عوام کے علم میں آگیا تو تباہی آجائے گی؟

ریمنڈ ڈیوس پولیس کے تفتیش کرنے والوں کے سوالات کا جواب دینے سے انکار کیوں کرتا رہا؟ ظاہر ہے کہ لاہور کی قونصل جنرل کے مشورے سے جو تین تین گھنٹے اس سے گفتگو کیا کرتیں۔ کس چیز کے بارے میں وہ اس سے بات کرتی تھیں؟ کیا وہ اس کا حوصلہ بندھانے جاتی تھیں یا کسی حکمتِ عملی کی جزئیات پر بحث کرنے؟ ایک ملزم کو وکیل کے مشورے کی ضرورت ہوتی ہے۔ سرپرست سفارت کار کو میدان میں بروئے کار آنا ہوتا ہے۔ وہ جیل کے اندر اتنا قیمتی وقت کیوں برباد کرتی رہیں؟ کیا اُنہیں اندیشہ تھا کہ وہ پاکستان میں زیرزمین پھیلے امریکی نیٹ ورک کی تفصیلات بتادے گا یا کچھ اس سے بڑھ کر بھی؟

امریکیوں نے ریمنڈ ڈیوس کو مزنگ سے اُٹھا کر لے جانے کے لیے اتنا بڑا خطرہ کیوں مول لیا۔ رائفلیں اُٹھائے ان کے لوگ ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ایک معصوم جان کو کچلنے کے مرتکب ہوئے۔ پھر اس گاڑی کے سواروں کو ہر قیمت پر بچانے کی کوشش کی حتیٰ کہ ملک سے باہر بھیج دیا۔ پنجاب حکومت کی طرف سے چھ عدد خطوط لکھنے جانے کے باوجود کہ قونصل خانہ مجرموں کو پناہ دینے کا مرتکب ہے، مرکزی حکومت سوئی کیوں رہی؟ وزارتِ داخلہ نے اُن کے نام ای سی ایل میں کیوں شامل نہ کئے؟ ہوائی اڈوں پر نگرانی کیوں نہ ہوئی؟

ایک تاریک بھید ہے، ایک گہرا تاریخی بھید! تاریخ مگر یہ بتاتی ہے کہ کوئی راز ہمیشہ راز نہیں رہتا۔ بات کھلے گی اور نتائج پیدا کرے گی۔ وجدان یہ کہتا ہے کہ پاک امریکہ تعلقات کی نوعیت تبدیل ہونے کا وقت آپہنچا۔ سیاسی قیادت اگر نہ سمجھ پائی تو وہ عوامی طوفان کی نذر ہو سکتی ہے۔ دریا کی لہروں کے خلاف کب کون تیر سکا ہے؟ تاریخ میں جب طوفان اُٹھتے ہیں تو تنکے راہ نہیں روکتے!!

['ناتمام' از ہارون الرشید: 23 فروری 2011ء]

ایمان وعقائد

حافظ محمد زبیر

کیا صفاتِ الٰہیہ میں ائمہ اربعہ 'مفوضہ' ہیں؟

برصغیر کے حنفی حضرات عقیدہ میں کس منہج سے تعلق رکھتے ہیں؟

توحید کی علماے کرام نے تین اقسام بیان کی ہیں:

① توحید اُلوہیت

② توحید ربوبیت

③ توحید اسماء وصفات

توحید اسماء وصفات کے بیان میں **اہل سنت والجماعت** یعنی صحابہ، تابعین، تبع تابعین، ائمہ اربعہ اور محدثینؒ کا عقیدہ یہ ہے کہ وہ کتاب وسنت میں بیان شدہ اسماء وصفاتِ باری تعالیٰ کے حقیقی واصلی معنی کا اثبات کرتے ہیں جبکہ اس کی کیفیت بیان نہیں کرتے مثلاً قرآن میں اللہ تعالیٰ کے لیے صفت 'ید' کا اثبات ہے تو اہل سنت والجماعت اللہ کے لیے صفتِ 'ید' کے حقیقی لغوی وعرفی معنی کا اثبات کرتے ہیں اور اس کی کیفیت یا تشبیہ بیان کرنے کو بدعت قرار دیتے ہیں۔

اہل سنت والجماعت کے اس عقیدہ کے برعکس ایک اُسلوب **اہل تاویل** کا ہے جو صفاتِ ذاتیہ کے علاوہ دیگر اَسماء وصفاتِ باری تعالیٰ کو بھی اُن کے حقیقی معنی کے بجائے مجازی معنی پر محمول کرتے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات میں 'ید' بمعنی ہاتھ ہے۔ اہل سنت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ پاؤں وغیرہ مانتے ہیں، لیکن اہلِ تاویل صفتِ ید کا مجازی معنی 'قدرت' بیان کر دیتے ہیں اور اس لفظ کے حقیقی معنی 'ہاتھ' کا اللہ کی ذات کے لیے اِثبات نہیں کرتے ہیں۔ اہل تاویل جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذاتی صفات کی تاویل کرتے ہیں اسی طرح صفاتِ لازمہ اور غیر لازمہ ناموں سے تقسیم کر کے ان کی بھی کوئی نہ کوئی تاویل کرتے ہیں اگرچہ اہل تاویل کے ہاں تعبیرات کے بعض باریک فرق پائے جاتے ہیں۔ تاہم تاویل کرنے میں معتزلہ، اشاعرہ اور

ماتریدیہ وغیرہ سب شامل ہیں۔ معتزلہ اسماء و صفات دونوں کی حقیقت کے منکر ہیں جبکہ اشاعرہ اور ماتریدیہ 'ید' (ہاتھ) وغیرہ کے تو منکر ہیں، لیکن اسماءِ الٰہی کے قائل ہیں البتہ تین صفاتِ فعلیہ (غیر لازمہ) میں اس طرح تاویل کرتے ہیں کہ 'حقیقت' کے بجائے 'مجاز' کو ہی تسلیم کیا جائے، مثلاً اہل تاویل کے ہاں اللہ تعالیٰ لفظی گفتگو پر قادر نہیں، لہٰذا قرآنِ کریم اللہ تعالیٰ کی نفسی کلام ہے۔ البتہ صفاتِ باری تعالیٰ میں سے چار صفاتِ لازمہ حیات، قدرت، علم اور ارادہ کے قائل ہیں جب کہ کلام، سمع اور بصر جو صفات غیر لازمہ کہلاتی ہیں۔ اہل سنت اور اشاعرہ، ماتریدیہ کے ہاں یہی معرکۃ الآراء ہیں۔

اہل سنت والجماعت کے بالمقابل تاویل سے بچنے کا ایک دوسرا طریق کار **اہل تفویض** کا ہے جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے لیے کوئی مجازی معنیٰ پیش کر کے تاویل تو نہیں کرتے، لیکن سرے سے عربی الفاظ کا مفہوم ہی تسلیم کرنے سے انکار کر جاتے ہیں اور ان صفات کو اللہ کے سپرد کر دینے کا مقصد یہ بیان کرتے ہیں کہ اُن کا کوئی لغوی معنی بھی بیان نہ کیا جائے۔

مولانا سلیم اللہ خان صاحب کا موقف

ماہنامہ 'وفاق المدارس' ملتان کے نومبر ۲۰۱۰ء کے شمارہ میں وفاق المدارس العربیۃ کے صدر اور شیخ الحدیث مولانا سلیم اللہ خان کا ایک مضمون شائع ہوا جس میں صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے بحث کی گئی ہے۔ اس مقالہ میں مولانا نے سلفی حضرات کو ہدفِ تنقید بناتے ہوئے مسئلۂ صفاتِ باری تعالیٰ میں اُنہیں متشدد قرار دیا ہے۔ ہمیں اس وقت سلفی حضرات کے تشدد اور عدمِ تشدد پر کوئی بحث نہیں کرنا بلکہ ائمہ اربعہ کے بارے میں مولانا کی اس مسئلے میں ایک بنیادی غلط فہمی کو رفع کرنا مقصود ہے جس میں بہت سے معاصر حنفی علما شعوری یا لاشعوری طور پر مبتلا ہیں۔

مولانا سلیم اللہ خان نے توحیدِ اسماء وصفات کے ضمن میں اہل سنت کے تین مسالک بیان کیے ہیں اور اُن کے خیال میں جمہور اہل سنت یعنی صحابہ، تابعین اور ائمہ اربعہ کا موقف توحیدِ اسماء وصفات کے بیان میں یہ ہے کہ وہ اللہ کی صفات کے بارے مطلقاً تفویض کے قائل ہیں یعنی وہ اللہ کی صفات کی کیفیت بیان کرنا تو کجا ان کے لغوی/عرفی معنی ہی کے قائل نہیں

خواہ حقیقی ہوں یا مجازی۔ مولانا لکھتے ہیں:

" ①پہلا مسلک: جمہور علماے اہل سنت کا مسلک یہ ہے کہ یہ نصوص ان متشابہات میں سے ہیں جن کے معنی صرف اللہ تعالیٰ کو معلوم ہیں اور ہم ان کو ثابت تسلیم کرنے کے بعد، ان کے حقیقی یا مجازی معنی بیان و متعین نہیں کر سکتے۔ یہ متشابہ المعنی بھی ہیں اور متشابہ الکیفیہ بھی ہیں: وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللهُ یعنی اس کی تفسیر صرف اللہ ہی کو معلوم ہے، یہ مسلکِ تفویض ہے اور یہی جمہور متقدمین اہل سنت اور آئمہ اربعہ کا مسلک ہے۔

②دوسرا مسلک یہ ہے کہ یہ نصوص اپنی حقیقت پر ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت کرتے ہوئے، اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان جو حقیقی معنی اس کے ہو سکتے ہیں۔ وہی مراد ہیں، اس کی کیفیت، کنہ اور صورت کیا ہو گی؟ یہ معلوم نہیں، یعنی یہ نصوص وصفات معلوم المعنی اور متشابه الكيفية ہیں۔اسی مسلک کی وضاحت میں مشہور مقولہ کہا گیا: الإستواء معلوم والكيف مجهول والسؤال عنه بدعة اور الاستواء غير مجهول والكيف غير معقول والإيمان به واجب. امام مالک اور ان کے اُستاذ ربیعہ بن ابو عبدالرحمن وغیرہ کی طرف یہ مقولہ منسوب ہے۔

③اہل السنت والجماعت کا تیسرا مسلک یہ ہے کہ ان صفات ونصوص کے ایسے معنی مجازی بیان کیے جائیں جو اللہ تعالیٰ کے شایانِ شان ہوں اور لفظ کے اندر اس معنی کے مراد لینے کی گنجائش ہو، مثلاً ید سے قدرت، وجہ سے ذات اور استوا سے اِستیلا مراد لیا جا سکتا ہے۔اس مسلک کو 'مسلکِ تاویل' کہتے ہیں اور اکثر متاخرینِ اہل سنت نے اس مسلک کو اختیار کیا ہے۔البتہ جو مجازی معنی مراد لیے جاتے ہیں، وہ یقینی اور قطعی نہیں ہوتے اور نہ ہی وہ ان پر جزم کا عقیدہ رکھتے ہیں، بلکہ وہ ظن اور احتمال کے درجہ میں ہوتے ہیں، یعنی ید کی تاویل وہ قدرت سے کر کے کہتے ہیں کہ یہ ایک تاویل اور احتمالی تفسیر کے درجہ میں ہے۔ید سے یقینی اور حتمی طور پر نصوص کے اندر قدرت کے معنی مراد ہیں، اس کا عقیدہ وہ نہیں رکھتے۔"[1]

آگے چل کر ایک مقام پر مولانا سلیم اللہ خان صاحب اس بارے مولانا عبدالحہ لکھنوی کی تحقیق سے اختلاف کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

---

1 : ماہنامہ 'وفاق المدارس' ص۸، ۷ نومبر ۲۰۱۰ء

''مولانا عبد الحہ لکھنوی نے دوسرے مسلک کو اکثر علما کا اور تیسرے مسلک کو اکثر متاخرین متکلمین کا مذہب قرار دیا، چنانچہ مولانا سلیم اللہ خاں اپنے ایک فتویٰ میں لکھتے ہیں:

''اس باب میں علما کے چند مسلک ہیں: ایک مسلکِ تاویل کہ استوا بمعنی استیلا اور ید بمعنی قدرت اور وجہ بمعنیٰ ذات، وعلیٰ ہذا القیاس اور یہی مختار اکثر متاخرین متکلمین کا ہے۔ دوسرا مذہب: تشابه فی المعنی وفی الکیفیة۔ تیسرا مسلک: معلوم المعنی، متشابہ الکیفیہ اور حق ان میں مسلکِ ثالث ہے اور یہی مذہب صحابہ وتابعین وائمہ مجتہدین ومحدثین وفقہا واُصولیین محققین ہے۔

راجح اور محتاط مسلک: لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر علما نے پہلا مسلک اختیار کیا ہے جو مسلک تفویض سے مشہور ہے اور وہی مسلک سب سے زیادہ اَسلم اور مذہبِ محتاط ہے۔'' [1]

اپنے مقالہ کے آخر میں مولانا سلیم اللہ خاں لکھتے ہیں:

''علامہ ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم اس مسئلہ میں متشدد تھے لیکن سلفی حضرات اور غیر مقلدین صرف اپنے مسلک کو حق سمجھتے ہیں اور اسی کو اہل سنت کا مسلک قرار دیتے ہیں، بقیہ حضرات کو وہ گمراہ اور باطل پر سمجھتے ہیں۔ جمہور اہل السنت جن میں حضرات صحابہ، تابعین اور جلیل القدر ائمہ کرام داخل ہیں کو گمراہ سمجھنا، خود بڑی گمراہی ہے۔'' [2]

مسئلے کا تاریخی پس منظر

مولانا سلیم اللہ خان صاحب نے اپنے اس مقالہ میں تفویض مطلق کے مسلک کی نسبت صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہؒ کی طرف کی ہے جو خلافِ حقیقت ہے۔ اس مسئلے میں مولانا سلیم اللہ خان صاحب کی نسبت مولانا عبد الحہ لکھنوی کی تحقیق راجح اور امر واقعہ کے زیادہ قریب ہے کہ صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ اربعہ کا مسلک تفویض مطلق نہیں تھا بلکہ وہ صفاتِ باری تعالیٰ کو معلوم المعنی اور متشابہ الکیفیہ بیان کرتے تھے۔

اس مسئلے پر تحقیقی گفتگو سے پہلے ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اس اُلجھن کو سامنے لائیں

---

1 ماہنامہ 'وفاق المدارس' ص 9

2 ایضاً: ص ۱۳

جس کے پیش نظر وہ عقیدہ میں ائمہ اربعہ کی تقلید حرام سمجھنے کی بنا پر امام ابو حنیفہ (متوفی ۱۵۰ھ) کی تقلید ترک کر دیتے ہیں لیکن حنفی عوام کے سامنے اپنے امام کی مخالفت کے طعن سے بچنے کے لیے امام صاحب کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے تاویلات اور حِیَل کا ایک نہ ختم ہونے والا باب کھول دیتے ہیں۔ جن حضرات نے ائمہ اربعہ رحمہم اللہ کے مناقب پر لکھی جانے والی کتب کا مطالعہ کیا ہے اور وہ سلف صالحین اور ائمہ مجتہدین کے دور کے بہت بعد چوتھی صدی ہجری میں پیدا ہونے والے فقہی جمود کے پس منظر سے بھی واقف ہیں، اس مناظراتی، جدلیاتی اور فکری جنگ سے ضرور آگاہ ہوں گے جو چوتھی صدی ہجری کے تقلیدی جمود کے دور سے شروع ہو کر صدیوں حنفیہ اور شافعیہ کے مابین جاری رہی۔ بعد ازاں ایک طرف تو شافعیہ جغرافیائی اعتبار سے شرقِ بعید مثلاً انڈونیشیا، ملائیشیا وغیرہ کے علاقوں میں پھیل گئے اور دوسری طرف برصغیر پاک وہند میں تقلیدِ جامد کے خلاف شاہ ولی اللہ دہلوی اور ان کے ہمنواؤں کی طرف سے فروغِ حدیث (اہل حدیث) کی تحریک برپا ہوئی یعنی نصوص کو فصوص پر اور سنت کو فقہ پر ترجیح دینے یا اجتہاداتِ ائمہ کو کتاب وسنت پر پیش کرنے کے دور کا آغاز ہوا تو ان مناظروں اور مجادلوں کا رخ شافعیہ سے اہل حدیث کی طرف پھر گیا اور حنفیہ اور غیر مقلد اہل حدیث کے مابین بظاہر نہ ختم ہونے والے مناظرات کے ایک طویل سلسلہ نے جنم لیا۔

اہل حدیث کے ساتھ اس فکری اور علمی مباحثہ میں علماے حنفیہ نے ائمہ کی تقلید پر اتنا زور دیا کہ نہ صرف ائمہ اربعہ میں سے ہر ایک کی تقلید شخصی کو واجب قرار دیا بلکہ اُنہوں نے اپنے عوام الناس میں اس فکر کو خوب اچھی طرح راسخ کر دیا کہ فقہی مسالک میں تقسیم ہو کر ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کی تقلید کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ مزید برآں اپنی درسگاہوں میں ائمہ اربعہ میں سے بھی ائمہ ثلاثہ کے موقف پر امام ابو حنیفہ کے مذہب کو عقلی ونقلی دلائل سے راجح قرار دینے کے لیے زندگیاں کھپا دیں اور بعض انتہا پسندوں نے تو فقہ حنفی کے راجح ہونے کے دلائل میں سے ایک دلیل یہ بھی بیان کر دی کہ سیدنا حضرت عیسیٰؑ بھی امام

ابو حنیفہ کے مقلد[1] ہوں گے۔ علماے حنفیہ نے اگرچہ یہ سارا کام اس پردہ میں کیا ہے کہ عدمِ تقلید ایک فتنہ ہے اور اس سے اجتناب ضروری ہے حالانکہ اعتقادی مسائل میں ان کے ہاں بھی تقلید حرام ہے۔ پس حنفیہ نے اہل حدیث پر اس لحاظ سے بہت زیادہ طعن کیا کہ وہ غیر مقلد ہیں اور کسی متعین امام کی تقلید کے قائل نہیں ہیں یہاں تک کہ حنفی عوام الناس میں 'غیر مقلد ہونا' ایک گالی بن کر رہ گیا۔

ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ حنفی علما نے اپنے عوام کے سامنے اہل حدیث کا اتباع اور تقلید میں فرق کا وہ موقف، جو ولی اللّٰہی تحریک کی اساس ہے، صحیح طور پر آج تک پیش ہی نہیں کیا حالانکہ بہت سے دیوبندی علما بھی شاہ ولی اللہ کی فکر کے حاملین میں سے ہونے کے دعویدار ہیں۔ پس جہاں تک عقیدہ میں تقلید کا مسئلہ ہے تو اس بارے حنفی اور اہل حدیث علما کا اتفاق ہے کہ تقلید نہیں ہونی چاہیے، لیکن فقہی وفروعی مسائل میں دونوں کے مابین 'اتباع' یعنی کتاب وسنت کی دلیل کی بنیاد پر سلف صالحین کی پیروی اور 'تقلید' یعنی بلا دلیل کسی متعین فقیہ کی پیروی کا فرق ہے۔ 'تقلید' کا لفظ آج کل عرب ممالک میں 'نقالی' کے لیے استعمال ہوتا ہے، مثلاً سڑکوں پر یہ بورڈ آویزاں ہوتے ہیں: احذر التقلید ولاحظ المارکة ''نقالوں سے ہوشیار رہو اور ٹریڈ مارک دیکھ کر سودا کرو''

حنفی علما کے نزدیک بے علم عوام الناس کے لیے فقہی مسائل میں ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک امام کی تقلید ہونی چاہیے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اعتقادی مسائل تو اس سے زیادہ مشکل اور پیچیدہ ہونے کے باوصف تقلید ائمہ کے حقدار کیوں نہیں ہیں؟ حنفیہ میں سے عقائد میں تقلید کے حرام ہونے کی وجہ ہی سے بعض حنفی اعتقادی طور پر معتزلی ہوتے ہیں جیسا کہ علامہ زمخشریؒ اور بعض سلفی بھی ہیں جیسا کہ امام ابو یوسف، امام محمد، امام طحاوی، اور ابن ابی العز حنفی رحمہم اللہ وغیرہ۔ بعض علما نے امام بزدوی اور ملا علی قاری کے متعلق سلفی ہونے کا دعوی کیا ہے اور بعض 'اشعری' ہیں جیسا کہ شیخ احمد سرہندی (مجدد الف ثانی) جبکہ برصغیر

1 فتاویٰ شامیہ: جلد ۱/ص ۱۴۲، دار احیاء التراث العربی

کے احناف کی اکثریت 'ماتریدی' ہے جیساکہ اکابر علماے دیوبند کی اکثریت 'ماتریدیہ' ہے۔ خلیجی ممالک کے اکثر حنفی عقیدہ میں سلفی ہیں۔

عقیدہ کی مذکورہ بالا تقسیم تو حنفیہ کے مابین قرونِ وسطیٰ میں رہی ہے جبکہ برصغیر پاک وہند میں یہ حضرات تصوف میں غلو اور اعتدال کی بحث کے نتیجے میں دو بڑے دھڑوں بریلوی اور دیوبندی مسالک میں تقسیم ہو گئے ہیں۔ آج حنفی بریلوی علماء کی اکثریت کو توحیدِ اُلوہیت کے باب میں جب امام ابو حنیفہ اور متقدمین فقہاے حنفیہ کے اقوال سنائے جاتے ہیں اور اُنہیں اعتقادی مسائل میں اپنے حنفی ائمہ سلف کی پیروی کی دعوت دی جاتی ہے تو اُن کا سادہ جواب یہ ہوتا ہے کہ ''عقائد میں تقلید حرام ہے۔''

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حنفیہ نے فقہی مسائل میں تو تقلیدِ جامد کا ثبوت دیا اور اس کو واجب قرار دیا لیکن اعتقادی مسائل میں امام ابو حنیفہ کی تقلید نہ کرنے کی وجہ سے یہ کئی فرقوں اشعری، ماتریدی، معتزلی، بریلوی، دیوبندی، حیاتی، مماتی، وجودی، شہودی، مفوضہ، مؤوّلہ وغیرہ میں بٹ گئے۔ پس حنفیہ من وجہ مقلد ہیں اور من وجہ غیر مقلد ہیں۔ فقہی مسائل میں حنفی مذہب کے مقلد ہیں جب کہ اعتقادی مسائل میں یہ امام ابو حنیفہ کی تقلید کے قائل نہیں ہیں۔

اس کے برعکس سلف صالحین کی اتباع کے دعویدار 'اہل حدیث' کی دعوت یہ ہے کہ اعتقادی مسائل میں ائمہ سلف یعنی صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ اربعہ کی پیروی ہونی چاہیے اسی بنا پر اعتقادی مسائل میں سلف صالحین کی اتباع پر کاربند ہونے کی وجہ سے ہی اہل حدیث 'سلفی' کہلاتے ہیں۔ جبکہ فقہی مسائل میں اہل حدیث کسی متعین امام کی تقلید کے قائل نہیں ہیں۔ بلکہ تمام فقہی آراء کو کتاب وسنت پر پیش کر کے اقرب الی السنۃ کو اختیار کر لیتے ہیں۔

البتہ دو بنیادی باتوں کی وضاحت ضروری ہے کہ اہل حدیث فقہی مسائل میں اگر علماے اُمت کا اجماع ہو تو اس اجماع کی حجیت کے قائل ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ جب اہل حدیث کسی متعین امام کی تقلید نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ تجدد کی راہ پر ہیں یا کسی نئی

فقہ کی تدوین کر رہے ہیں بلکہ علماے اہل حدیث کے فتاویٰ کو دیکھا جائے تو یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ وہ ائمہ کی آراء کو قرآن وسنت پر پیش کر کے قدیم مسائل میں کسی نہ کسی فقہی مذہب یا امام کے ساتھ کھڑے نظر آتے ہیں، البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ ائمہ اربعہ تک محدود نہیں رہتے۔ جدید مسائل میں وہ کتاب وسنت سے ائمہ سلف کے طریقہ کار کی روشنی میں براہ راست استدلال کرتے بھی نظر آتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ فقہاے حنفیہ نے فقہ حنفی میں متقدمین حنفیہ سے مروی متفرق اَقوال میں دلائل کی بنیاد پر راجح اور مرجوح قول کا جو منہج اختیار کیا ہے اور ایسے فقہا کو 'اصحابِ ترجیح' کا نام دیا ہے، اسی معنی میں اہل حدیث نے فقہ حنفی کی بجائے جمیع مذاہبِ اسلامیہ یا معروف فقہا سے مروی اَقوال میں قرآن وسنت کے دلائل کی بنیاد پر ترجیح کا موقف اختیار کیا ہے۔ قدیم فقہی مسائل میں اہل حدیث کا یہی طرزِ عمل ہے البتہ جدید مسائل کا معاملہ ہو تو وہاں شاید حنفی مقلدین، اہل حدیث کی نسبت زیادہ اجتہاد کرنے کے دعوے دار ہیں جب کہ محقق اہل حدیث اسے 'حیلے' قرار دیتے ہیں۔ آج کل مروّجہ اسلامی بینکاری اس کی ایک مثال ہے۔ گویا قدیم مسائل میں حنفی ایک ہی مذہب میں علما کے اختلاف کی صورت میں ترجیح قائم کرنے کے باوجود اسے تقلید کا نام دیتے ہیں جبکہ اہل حدیث جمیع مذاہبِ اسلامیہ: حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی، ظاہری وغیرہ کے اقوال وآرا میں دلیل کی بنیاد پر راجح اور مرجوح کا تعین کرتے ہیں اور اسے 'اتباع' کا نام دیتے ہیں۔

چونکہ اعتقادی مسائل میں عموماً قیاس وغیرہ کی گنجائش نہیں ہوتی، یعنی اعتقادی مسائل حالات اور زمان ومکان کی تبدیلی سے متاثر ہوئے بغیر ویسے ہی رہتے ہیں، کیونکہ ان کا تعلق زیادہ تر خبر سے ہوتا ہے جو غیر متبدل رہتی ہے، پس عقیدے کے مسائل میں ہمیں پیچھے سے پیچھے جانا چاہیے اور سلف صالحین یعنی صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ اسلاف ؒ کے طریق کار کی اتباع کرنی چاہیے۔

یہ بھی واضح رہے کہ اعتقادی مسائل میں اہل سنت (سلف صالحین) میں کوئی زیادہ اختلاف مروی نہیں ہے بلکہ اکثر اعتقادی مسائل میں ائمہ اربعہ کا عقیدہ تقریباً ایک ہی ہے،

سوائے ایمان کی حقیقت کے مسئلے میں، جس میں امام ابو حنیفہؒ کا اختلاف نقل ہوا ہے لیکن اس مسئلے کے بارے میں بھی امام ابن عبد البر مالکی اور امام ابن ابی العز حنفی کا رجحان یہ ہے کہ امام ابو حنیفہ نے اسی قول کی طرف رجوع[1] کر لیا تھا جو ائمہ ثلاثہ کا ہے۔ اس کے برعکس فقہی اور عملی مسائل میں حالات اور زمانے کے تغیرات کی وجہ سے بہت دفعہ نصوص کا اطلاق تبدیل ہونے کا مغالطہ ہوتا ہے۔ اسی بنا پر ابن قیم اسے فتوی کی تبدیلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ لہٰذا ان میں اجتہاد کی بڑی اہمیت ہوتی ہے جو قدیم مسائل میں اصحابِ ترجیح کا سا ہوتا ہے نہ کہ اجتہادِ مطلق کی حیثیت کا حامل۔ اہل الحدیث کے فتاویٰ ہماری اس بات کے شاہد ہیں۔

پس حنفیہ نے کسی متعین فقہ کی تقلید کو لازم قرار دے کر کسی تعبیر خاص کو عین دین اسلام یا وحی کی صورت شریعتِ اسلامیہ کی طرح دائمی قرار دے دیا ہے جبکہ اہل حدیث کے نزدیک کوئی متعین فقہ ایک عارضی اور بدلتی شے ہے جب کہ صرف وحی والہام (شریعتِ اسلامیہ) ہی دائمی ہے لہٰذا حق کسی ایک متعین فقہ میں محصور نہیں ہے چنانچہ وہ کتاب وسنت کی بنیاد پر سب فقہوں اور جمیع فقہاے محدثین سے برابر کی سطح پر استفادہ کے قائل ہیں۔

بعض حنفی علما نے جب یہ دیکھا کہ اہل الحدیث اعتقادی مسائل میں سلف صالحین کی اتباع کے قائل ہیں اور حنفیہ کو اس باب میں امام ابو حنیفہ کے سلفی ہونے کی بنا پر ان کی تقلید کی دعوت بھی دیتے ہیں تو اُنہوں نے امام ابو حنیفہ سے مروی سلفی عقیدے میں تاویلات کا ایک باب کھول کر اُنہیں 'ماتریدیہ' کی طرح 'مؤوّلہ' ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی۔ مولانا سلیم اللہ خاں صاحب نے بھی اپنے اس مقالہ میں ان علماء کی مذمت کی ہے جو امام ابو حنیفہ کو کھینچ تان کر اہل تاویل میں داخل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ تاویل کے رد عمل میں ان علما نے ایک دوسری انتہاء یہ اختیار کی کہ اپنے امام کو مفوضہ بنا دیا۔ ان علما میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا سلیم اللہ خان صاحب اور بعض علماے دیوبند شامل ہیں، حالانکہ امام ابو حنیفہ

1 اعتقاد الأئمة الأربعة از ڈاکٹر محمد بن عبدالرحمن الخمیس: ص۷

کے سلفی عقیدے کو کھینچ تان کر 'مفوضہ' اور اہل تفویض کا عقیدہ بنانے کی یہ کاوش امام ابو حنیفہؒ (سلفی) پر بڑی زیادتی ہے۔ واضح رہے کہ مولانا سلیم اللہ خان صاحب، امام ابو حنیفہ کا عقیدہ 'تفویض' بتلاتے ہیں اور اسی عقیدے کو حق قرار دیتے ہیں اور خود بھی اسی کے قائل ہیں۔ گویا علماے دیوبند میں بعض خود مفوضہ ہونے کی بنا پر امام ابو حنیفہ کی طرف تفویض کے عقیدے کی نسبت کرتے ہیں جبکہ اکثر علماے دیوبند اہل تاویل ہیں اور ابو منصور ماتریدی (متوفی ۳۳۳ھ) کے پیروکار ہیں۔

کیا ائمہ اربعہ مفوضہ تھے؟

اس تمہید کے بعد ہم اصل نکتہ کی طرف آتے ہیں کہ کیا مولانا سلیم اللہ خان صاحب کا یہ دعویٰ درست ہے کہ سلف صالحین یا ائمہ اربعہ مفوضہ ہیں؟ اگر ہم اس مسئلے کی تحقیق میں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کو شامل کرلیں تو شاید یہ مضمون بہت طویل ہو جائے لہٰذا سر دست ہم ائمہ اربعہ کے بارے بالعموم اور امام ابو حنیفہ کے بارے بالخصوص اس موقف کا جائزہ لے رہیں ہے کہ وہ اہل تفویض میں سے تھے یا نہیں؟

امر واقعہ یہ ہے کہ ائمہ اربعہ یا فقہاے محدثین اور متقدمین صوفیا کا صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے عقیدہ وہی ہے جسے آج ہم 'سلفی عقیدہ' کے نام سے جانتے ہیں۔ یعنی ائمہ اربعہ اور فقہائے محدثین صفاتِ باری تعالیٰ کے لیے مروی الفاظ کو ان کے حقیقی معانی پر محمول کرتے ہیں لیکن ان صفات کی کیفیت بیان نہیں کرتے گویا ائمہ اربعہ یہ کہتے ہیں کہ جب قرآن نے اللہ تعالیٰ کے لیے صفتِ 'ید' کا اثبات کیا ہے تو 'ید' کے حقیقی معنیٰ ہاتھ کا اللہ تعالیٰ کے لیے اثبات کیا جائے گا، لیکن اللہ کا ہاتھ کیسا ہے؟ ہم اس کی کیفیت بیان نہیں کریں گے اور نہ ہی اس کے بارے قیل و قال میں پڑیں گے۔

امام ابن تیمیہ (متوفی ۷۲۸ھ) سے جب یہ سوال ہوا کہ دو اشخاص کا آپس میں جھگڑا ہوا ہے اور ان میں سے ایک یہ کہتا ہے کہ جو شخص اللہ کے آسمان میں ہونے کا اعتقاد نہ رکھے تو وہ گمراہ ہے اور دوسرا شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی جگہ میں منحصر نہیں ہے تو اس بارے امام شافعی (متوفی ۲۰۴ھ) کا عقیدہ کیا ہے؟ تو امام صاحب اس سوال کے جواب میں لکھتے ہیں:

الحمد لله، اعتقاد الشافعي رضي الله عنه واعتقاد سلف الإسلام كمَالك والثوري والأوزاعي وابن المبارك وأحمد بن حنبل وإسحٰق بن راهويه وهو اعتقاد المشايخ المقتدٰى بهم كالفُضيل بن عياض وأبي سليمان الداراني وسهل بن عبد الله التستري وغيرهم، فإنه ليس بين هؤلاء الأئمة وأمثالهم نزاع في أصول الدين وكذٰلك أبو حنيفة رحمة الله عليه فإن الاعتقاد الثابت عنه في التوحيد والقدر ونحو ذلك موافق لاعتقاد هؤلاء واعتقاد هؤلاء هو ما كان عليه الصحابة والتابعون لهم بـإحسان وهو ما نطق به الكتاب والسنة[1]

''امام شافعی رضی اللہ عنہ اور سلف صالحین امام مالک، امام اوزاعی، امام عبداللہ بن مبارک، امام احمد بن حنبل، امام اسحق بن راہویہ رحمہم اللہ کا بھی وہی عقیدہ ہے جو ان مشائخ کا ہے جن کی لوگوں نے پیروی کی ہے جیسا کہ فضیل بن عیاض، ابو سلیمان دارنی اور سہیل بن عبداللہ تستری رحمہم اللہ وغیرہ۔ ان تمام ائمہ میں اُصولِ دین یعنی عقائد میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اسی طرح کا معاملہ امام ابو حنیفہ کا بھی ہے یعنی توحید اور تقدیر وغیرہ کے مسائل میں امام ابو حنیفہ سے جو عقیدہ ثابت ہے، وہ وہی عقیدہ ہے جو مذکورہ بالا ائمہ کا ہے۔ اور ان ائمہ کا عقیدہ وہی ہے جو صحابہ اور تابعین کا ہے۔ اور صحابہ وتابعین کا عقیدہ وہی ہے جو کتاب وسنت میں صراحتاً بیان ہوا ہے۔''

علامہ نواب صدیق حسن خان (متوفی ۱۳۰۷ھ) ایک جگہ سلف صالحین کا عقیدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

فمذهبنا مذهب السلف إثبات بلا تشبيه وتنزيه بلا تعطيل وهو مذهب أئمة الإسلام كمالك والشافعي والثوري وابن المبارك والإمام أحمد وغيرهم فـإنه ليس بين هؤلاء الأئمة نزاع في أصول الدين وكذلك أبو حنيفة رضي الله عنه فإن الاعتقاد الثابت عنه موافق لاعتقاد هؤلاء وهو الذي نطق به الكتاب والسنة[2]

---

1 مجموع الفتاویٰ: ۵/۲۵۶، طبع دار الوفاء، ۲۰۰۵ھ

2 تفسیر فتح البیان از نواب صدیق حسن خان

''ہمارا مسلک اس بارے وہی ہے جو سلف صالحین کا تھا اور وہ یہ کہ اللہ کی صفات کا اثبات کیا جائے لیکن اُنہیں مخلوق سے تشبیہ نہ دی جائے اور اللہ کی صفات کو کیفیات وغیرہ سے تو پاک قرار دیا جائے لیکن یہ پاک قرار دینا اس طرح نہ ہو کہ اس سے صفات ہی باطل ہو جائیں [یعنی ان کا ظاہری اور حقیقی معنی ہی باطل قرار پائے]۔ یہی مسلک امام مالک، امام شافعی، امام عبد اللہ بن مبارک، امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ کا ہے۔ ان ائمہ میں اُصولِ دین میں کوئی اختلاف مروی نہیں ہے۔ اسی طرح کا معاملہ امام ابو حنیفہ کا بھی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ سے جو عقیدہ ثابت ہے وہ وہی عقیدہ ہے جس کے قائل یہ ائمہ تھے اور اسی عقیدہ کا اثبات قرآن وسنت سے ہوتا ہے۔''

اب ہم نسبتاً تفصیل سے امام ابو حنیفہ اور دیگر ائمہ کا عقیدہ بنیادی مصادر سے نقل کر رہے ہیں:

امام ابو حنیفہ کا عقیدہ

❁ فخر الاسلام امام بزدوی (متوفی ۴۸۲ھ) فرماتے ہیں کہ امام ابو حنیفہ نے اعتقادی مسائل میں 'فقہ اکبر' کے نام سے ایک کتاب تصنیف کی تھی جس میں اُنہوں نے صفاتِ باری تعالیٰ کا اثبات کیا تھا اور صفات کے اثبات کا یہی منہج متقدمین فقہاے حنفیہ کا ہے۔ بزدوی لکھتے ہیں:

العلم نوعان: علم التوحيد والصفات وعلم الشرائع والأحكام والأصل في النوع الأول هو التمسک بالكتاب والسنة ومجانبة الهوٰى والبدعة ولزوم طريق السنة والجماعة الذي عليه الصحابة والتابعون ومضٰى عليه الصالحون وهو الذي كان عليه أدركنا مشايخنا وكان على ذلك سلفنا أعني أبا حنيفة وأبا يوسف ومحمد أو عامة أصحابهم رحمهم الله وقد صنّف أبو حنيفة رضي الله عنه في ذلك كتاب الفقه الأكبر وذكر فيه إثبات الصفات[1]

''علم دو قسم کا ہے: ایک توحید اور صفاتِ باری تعالیٰ کا علم اور دوسرا شرائع اور احکام کا علم

1 اُصولِ بزدوی: ص ۳، جاوید پریس، کراچی

ہے۔ پہلی قسم کے علم میں کتاب وسنت کو مضبوطی سے تھام لینا اور ہوائے نفس اور بدعتی مناہج سے دور رہنا اور اہل سنت والجماعت کے منہج کو مضبوطی سے پکڑ لینا ہی اصلاً مقصود ہے۔ اہل سنت والجماعت کا منہج وہی تھا جو صحابہؓ وتابعین کا ہے اور جو سلف صالحین کا ہے اور اسی منہج پر ہم نے اپنے مشائخ حنفیہ اور متقدمین حنفیہ یعنی امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد اور ان کے اصحابؒ کو پایا ہے۔ اس مسئلے میں امام ابو حنیفہ نے ایک کتاب 'فقہ اکبر' کے نام سے لکھی ہے اور اس کتاب میں اُنہوں نے صفات کا اثبات کیا ہے۔"

امام بزدوی کی اس عبارت میں چند بنیادی باتیں بیان ہوئی ہیں:

④ امام ابو حنیفہ نے اعتقادی مسائل میں ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام 'فقہ اکبر' ہے۔

⑤ اس کتاب میں جو عقیدہ بیان ہوا ہے وہ امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد اور کبار حنفی علما و مشائخ کا ہے۔

⑥ اس کتاب میں جو عقیدہ بیان ہوا ہے، وہی صحابہ وتابعین کا عقیدہ ہے۔

⑦ اس کتاب میں جو عقیدہ بیان ہوا ہے، وہ اہل سنت والجماعت کا ہے۔

اب ہم امام ابو حنیفہ کی اس کتاب میں بیان شدہ عقیدہ کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کیا ہے؟ کیا وہ تاویل کا عقیدہ ہے جیسا کہ ماتریدیہ حنفیہ کا عقیدہ ہے؟ یا وہ تفویضِ مطلق کا عقیدہ ہے جیسا کہ مولانا سلیم اللہ خان صاحب کا عقیدہ ہے؟ یا صفات کو ان کے حقیقی معنی پر باقی رکھنے اور کیفیت نہ بیان کرنے کا عقیدہ ہے جیسا کہ سلفی عقیدہ ہے؟

❁ امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں:

وله يد و وجه ونفس كما ذكره الله تعالىٰ في القرآن، فما ذكره الله تعالىٰ في القرآن من ذكر الوجه واليد والنفس فهو له صفات بلا كيف، ولايقال إن يده: قدرته أو نعمته لأن فيه إبطال الصفة وهو قول أهل القدر والاعتزال ولكن يده صفته بلا كيف وغضبه ورضاه من صفات الله تعالىٰ بلا كيف[1]

"اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ، چہرہ اور نفس ثابت ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ان صفات کا قرآن

1 الفقه الاكبر مع شرحه: ص27، مكتبة الفرقان، 1419ھ

میں اِثبات کیا ہے۔ پس اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنے لیے ہاتھ، چہرہ اور نفس کی جو صفات بیان کی ہیں تو وہ بلا کیفیت ہیں اور یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اللہ کے ہاتھ سے مراد اس کی قدرت ہے یا اس کی نعمت ہے کیونکہ اس طرح کے قول سے اللہ کی صفت باطل قرار پاتی ہے اور ایسا کام [یعنی صفات میں تاویل کرنا] معتزلہ اور قدریہ کرتے ہیں۔ لیکن 'ید' اللہ تعالیٰ کی صفت ہے بلا کیفیت کے، اور اللہ کا غضب اور اس کی رضا اس کی صفات ہیں بلا کیفیت۔''

اس عبارت میں ایک طرف تو امام ابو حنیفہ نے صفاتِ باری تعالیٰ کا اثبات کیا ہے اور دوسری طرف ان صفات میں تاویل سے منع کیا ہے اور تاویل کو معتزلی منہج قرار دیا ہے۔ گویا صفاتِ باری تعالیٰ میں تاویل کا مذہب تو قطعی طور پر ردّ ہو گیا یعنی تاویل والا مسلک امام صاحب اور اہل سنت والجماعت کا نہیں ہے۔

اب امام صاحب نے اللہ کی صفات کا جو اثبات کیا ہے تو کیا اس اثبات سے ان کی مراد یہ ہے کہ وہ ان صفات کا حقیقی معنی بھی بیان نہیں کرتے اور اِثبات سے مراد صرف الفاظ کا اثبات لیتے ہیں جیسا کہ مفوضہ کا عقیدہ ہے یا اُن کی مراد یہ ہے کہ وہ صفات کا حقیقی معنی تو بیان کرتے ہیں لیکن کیفیت بیان نہیں کرتے اور اثباتِ صفات سے ان کی مراد حقیقی معنیٰ کا اثبات ہے جیسا کہ سلفی عقیدہ ہے۔

ہم یہ کہتے ہیں کہ بلاشبہ امام ابو حنیفہ کی یہ عبارت مفوضہ کا ردّ کر رہی ہے اور سلفی عقیدے کو بیان کر رہی ہے کیونکہ امام صاحب نے جب صفات کا اثبات کیا تو کیفیت کی نفی کی ہے جو اس بات کا قرینہ ہے کہ وہ صفات کے حقیقی معنی کے قائل ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ قرآن میں بیان شدہ صفاتِ باری تعالیٰ کے اثبات سے مراد اگر لفظوں کا اثبات لیا جائے تو اس کا انکار قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ کی کلام ماننے والا کوئی مسلمان نہیں کر سکتا کیونکہ قرآن کے الفاظ کا انکار تو کوئی کافر کر سکتا ہے۔ یا وہ شخص جو قرآن کے اللہ کی کلام لفظی ہونے کا منکر ہے کیا امام صاحب اپنی عبارت ولکن یده صفة بلا کیف سے صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ کا انکار نہ کرنا؟ کیا امام صاحب یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ قرآن کے الفاظ بھی ثابت ہیں؟ یعنی امام صاحب اہل علم کو وہ عقیدہ بتلانا چاہتے ہیں جس سے مسلمانوں کا بچہ بچہ واقف ہے۔ نہیں

ایسا بالکل بھی نہیں ہے، بلکہ امام صاحب کا اس عبارت سے مقصود یہ ہے کہ صفات اپنی حقیقی معنٰی کے ساتھ ثابت ہیں لیکن بغیر کیفیت کے ہیں۔ اگر امام ابو حنیفہ کے لیے مفوضہ یا مولانا سلیم اللہ خان صاحب کا عقیدہ لیں تو پھر صفات کے اِثبات سے مراد صرف الفاظ کا اثبات ہو گا کیونکہ تفویض کی صورت میں تو کوئی بھی معنٰی مراد نہیں لیا جاتا۔

☜ اب ہم اس طرح آتے ہیں کہ کبار حنفی علما نے امام ابو حنیفہ کی ان عبارات سے تفویضِ مطلق کا عقیدہ سمجھا ہے یا صفات کے حقیقی معنی کے اثبات کا سلفی عقیدہ؟

⑧ فخر الاسلام امام بزدوی 'فقہ اکبر' کی اس عبارت کی شرح میں فرماتے ہیں:

[فهو له صفات بلا كيف] أي أصلها معلوم ووصفها مجهول لنا فلا يبطل الأصل المعلوم بسبب التشابه والعجز عن درك الوصف، رُوي عن أحمد بن حنبل رحمه الله تعالىٰ أن الكيفية مجهول والبحث عنه بدعة[1]

[**پس یہ اللہ کی صفات ہیں بلا کیفیت کے**] امام ابو حنیفہ کی اس عبارت سے مراد یہ ہے کہ ان صفات کا حقیقی اور اصلی معنٰی معلوم ہے جبکہ کیفیت مجہول ہے۔ پس ان صفات کے حقیقی اور اصلی معنی کا انکار اس وجہ سے نہ کیا جائے گا کہ اس سے مخلوق کے ساتھ [صفات میں] تشابہ لازم آتا ہے اور اس وجہ سے بھی اس حقیقی و اَصلی معنی کا انکار نہیں ہو گا کہ اس کی کیفیت کا اِدراک ممکن نہیں ہے۔ امام احمد بن حنبل سے مروی ہے کہ صفات کی کیفیت مجہول ہے اور اس کیفیت کے بارے بحث کرنا بدعت ہے:

⑨ ملا علی القاری (متوفی ۱۰۱۴ھ) فرماتے ہیں کہ صفات کے مسئلے میں جو عقیدہ امام ابن تیمیہ کا تھا، وہی امام ابو حنیفہ کا عقیدہ ہے جو اُنہوں نے 'فقہ اکبر' میں بیان کیا ہے۔ ملا علی القاری یہ بھی لکھتے ہیں کہ امام ابن تیمیہ کو تجسیم کا قائل قرار دینا صحیح نہیں ہے بلکہ صفات کے بارے ان کا موقف وہی تھا جو سلف صالحین کا ہے اور وہ یہ ہے کہ صفات کا معنی معلوم اور کیفیت مجہول ہے۔ ملا علی القاری لکھتے ہیں:

قال: الاستواء معلوم والكيف غير معقول والإيمان به واجب

1 شرح الفقہ الاکبر از امام بزدوی: ص ۱۰

والسؤال عنه بدعة — فَرَّقَ بين المعنٰى المعلوم من هذه اللفظة وبين الكيف الذي لا يعقله البشر وهذا الجواب من مالك رحمه الله شاف عام في جميع مسائل الصفات من السمع والبصر والعلم والحياة والقدرة والإرادة والنزول والغضب والرحمة والضحك — فمعانيها كلها معلومة وأما كيفيتها فغير معقولة إذ تعقل الكيف فرع العلم بكيفية الذات وكنهها- فإذا كان ذلك غير معلوم فكيف يعقل لهم كيفية الصفات والعصمة النافعة من هٰذا الباب أن يصف الله بما وصف به نفسه ووصف به رسوله من غير تحريف ولا تعطيل ومن غير تكييف ولا تمثيل بل يثبت له الأسماء والصفات وينفى عنه مشابهة المخلوقات فيكون إثباتك مُنزّها عن التشبيه ونفيك مُنزّها عن التعطيل فَمَنْ نفٰى حقيقة الاستواء فهو مُعطِّل ومن شبَّهه باستواء المخلوقات على المخلوق فهو مشبه ومن قال استواء ليس كمثله شيء فهو الموحد المنزه.انتهٰى كلامه وتبين مرامه وظهر أن معتقده موافق لأهل الحق من السلف وجمهور الخلف فالطعن التشنيع والتقبيح الفظيع غير موجه عليه ولا متوجه إليه فإن كلامه بعينه مطابق لما قاله الإمام الأعظم والمجتهد الأقدم في فقهه الأكبر ما نصه وله تعالى يد ووجه ونفس[1]

''[امام ابن تیمیہ کہتے ہیں:] امام مالک نے کہا کہ اللہ کا مستوی ہونا تو معلوم ہے لیکن کیفیت غیر معقول ہے اور اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کیفیت کے بارے سوال کرنا بدعت ہے۔ امام مالک نے ان الفاظ کے ذریعہ صفات کے معلوم معنٰی اور غیر معقول کیفیت میں فرق کیا ہے۔ امام مالک کا یہ جواب جمیع صفاتِ باری تعالیٰ مثلاً سماعت، بصارت، علم، حیات، قدرت، اِرادہ، نزول، غضب، رحمت اور ضحک وغیرہ کے بارے کافی وشافی ہے۔ پس جمیع صفاتِ باری تعالیٰ کے معانی معلوم ہیں جبکہ ان کی کیفیات غیر معقول ہیں

1 مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوٰۃ المصابیح، کتاب اللباس، الفصل الثانی

کیونکہ صفات کی کیفیات کا معقول المعنیٰ ہونا، ذات کی کیفیت اور اس کی کنہ کے علم کی ایک شاخ ہے۔ پس جب اللہ تعالیٰ کی ذات اور کنہ غیر معلوم ہے تو اس کے صفات کی کیفیات بھی معقول نہیں ہو سکتیں۔ اس مسئلے میں نافع اور محتاط قول یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ہر اس صفت سے موصوف کیا جائے جس کے ساتھ اللہ نے خود یا اللہ کے رسول نے اللہ تعالیٰ کو موصوف کیا ہو اور ان صفات کے معانی میں نہ تو تحریف کی جائے [یعنی تاویل] اور نہ ہی تعطیل کی جائے [یعنی ان صفات کے حقیقی معانی کا انکار کیا جائے یعنی تفویض مطلق وغیرہ] اور نہ ہی ان کی کیفیت بیان کی جائے اور نہ ہی ان کی مثال بیان کی جائے [یعنی مخلوق سے مشابہت دی جائے] بلکہ اللہ کے لیے جمیع اَسما اور صفات کا اثبات کیا جائے اور ان اسما و صفات کی مخلوق کے اسما و صفات سے مشابہت سے انکار کیا جائے۔ پس تیرا صفات کا اِثبات اس طرح ہو کہ اس میں تشبیہ موجود نہ ہو اور صفات کی کیفیات کے بارے تیری نفی یوں ہو کہ اس سے صفات کا ظاہری اور حقیقی معنیٰ کا انکار نہ ہو۔ پس جس نے اِستوا کے حقیقی معنیٰ کا ہی انکار کر دیا تو وہ معطلہ میں سے ہے اور جس نے استوا کی تشبیہ یوں بیان کی کہ یہ ایسا ہے جیسے ایک مخلوق دوسری مخلوق پر ہوتی ہے تو یہ مشبہ میں سے ہے اور جس نے یہ کہا کہ اِستوا تو ہے لیکن اس طرح کہ اس کی مانند کوئی شے نہیں ہے تو وہی درحقیقت موحد اور تنزیہ بیان کرنے والا ہے۔ یہاں پر امام ابن تیمیہ کا کلام ختم ہوا۔

[اب میں یعنی ملا علی القاری یہ کہتا ہوں] کہ اس کلام سے امام ابن تیمیہ کا مقصد واضح ہو گیا ہے اور اُن کا عقیدہ بھی کھل کر سامنے آگیا ہے اور یہ وہی عقیدہ ہے جو سلف صالحین اور جمہور خلف کا ہے۔ پس طعن و تشنیع اور بدترین تقبیح کی نسبت امام ابن تیمیہ کے لیے درست نہیں ہے۔ امام ابن تیمیہ کا کلام بعینہٖ وہی کلام ہے جسے امام اعظم اور مجتہد اکبر امام ابو حنیفہؒ نے اپنی کتاب 'فقہِ اکبر' میں بیان کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہاتھ اور چہرہ اور نفس ہے۔"

⑩ اپنی ایک اور کتاب فقه أبسط میں امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں:

لایوصف الله تعالیٰ بصفات المخلوقین، وغضبه ورضاه صفتان من صفاته بلا کیف، وهو قول أهل السنة والجماعة، وهو یغضب

ویرضٰی ولا یقال: غضبه عقوبته، ورضاه ثوابه[1]

''اللہ تعالیٰ کو مخلوق کی صفات سے موصوف نہیں کیا جائے گا۔ غضب اور رضا اللہ کی صفات میں سے دو صفات ہیں جن کی کیفیت بیان نہیں ہو گی۔ یہی اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ غضب میں بھی آتے ہیں اور راضی بھی ہوتے ہیں۔ یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اللہ کے غضب سے مراد اُس کی طرف سے سزا ہے اور اس کی رضا سے مراد اس کی طرف سے ثواب ہے۔''

⑪ عقیدہ کی مشہور کتاب العقیدہ الطحاویہ کے شارح علامہ ابن العز حنفی لکھتے ہیں:

رٰوی شیخ الإسلام أبو إسمٰعیل الأنصاري في کتابه الفارق بسنده إلی مطیع البلخي أنه سأل أبا حنیفة عمن قال: لا أعرف ربي في السماء أم في الأرض فقال : قد کفر لأن الله یقول: الرحمٰن علی العرش استوٰی وعرشه فوق سبع سماواته. قلت: فإن قال: إنه علیٰ العرش ولکن یقول لا أدري العرش في السماء أم في الأرض؟ قال: هو کافر لأنه أنکر أنه في السماء فمن أنکر أنه في السماء فقد کفر[2]

''شیخ الاسلام ابو اسماعیل انصاری نے اپنی کتاب 'الفارق' میں اپنی سند سے مطیع بلخی سے نقل کیا ہے کہ اُنہوں نے کہا کہ میں نے امام ابو حنیفہ سے اس شخص کے بارے سوال کیا جو یہ کہتا ہے: میں نہیں جانتا کہ میرا ربّ آسمان میں ہے یا زمین میں؟ تو امام صاحب نے فرمایا: اس نے کفر کیا کیونکہ اللہ تعالیٰ یہ فرماتے ہیں کہ وہ عرش پر مستوی ہیں اور اللہ کا عرش سات آسمانوں پر ہے۔ میں [یعنی مطیع بلخی] نے پھر یہ سوال کیا کہ اگر وہ شخص یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو عرش پر ہے لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ عرش آسمان میں ہے یا زمین میں؟ تو امام ابو حنیفہ نے کہا: یہ شخص بھی کافر ہے کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے آسمان میں ہونے کا انکار کیا ہے اور جس نے اللہ تعالیٰ کے آسمان میں ہونے کا انکار کیا تو وہ کافر ہے۔''

---

1 الشرح المیسر علی الفقهین الأبسط والأکبر :ص۱۵۹،مکتبہ الفرقان، ۱۴۱۹ھ

2 شرح العقیدة الطحاویة: ص۲۸۰، المکتب الاسلامی، بیروت ؛ الفقه الأبسط مع شرحه: ص۱۳۵،مکتبہ الفرقان ۱۴۱۹ھ ؛ العلو للذهبي: ص ۱۳۶،مکتبہ اضواء السلف، الریاض

مولانا سلیم اللہ خان صاحب نے امام ابن تیمیہ اور امام ابن قیم رحمہا اللہ کو متشدد قرار دیا ہے۔ اب وہ بتائیں کہ اس مسئلے میں متشدد کون ہے؟ تکفیر تو امام ابو حنیفہ کریں اور متشدد سلفیہ قرار پائیں۔ عقیدہ طحاویہ، عقیدے کی کتاب ہے جس کے مصنف حنفی فقیہ امام طحاوی ہیں۔ پھر اس کتاب کی شرح 'شرح عقیدہ طحاویہ' جس کا ہم نے حوالہ دیا ہے، ایک حنفی عالم دین ابن ابی العز حنفی (متوفی ۷۹۲ھ) کی ہے۔ پس حنفی عقیدے کی کتاب اور حنفی عالم دین (شارح) اس روایت کے ناقل ہیں اور نقل بھی حنفی فقہا کے حوالے سے کر رہے ہیں۔ اب بھی اگر اسکے جواب میں معاصر حنفی علما یہ کہیں کہ سلفیہ نے یہ عقیدہ امام ابو حنیفہ کے کھاتے میں ڈال دیا ہے تو اُن کا اللہ ہی حافظ ہے۔ 'فقہ اَبسط' میں بھی امام صاحب کا یہ قول موجود ہے جو خود امام صاحب کی طرف منسوب کتاب ہے۔ پھر جلیل القدر محدثین نے اس قول کی نسبت امام صاحب کی طرف ثابت کی ہے جیسا کہ امام ذہبی کی کتاب کا حوالہ ہم نے نقل کیا ہے:

⑫ امام بیہقی (متوفی ۴۵۸ھ) اپنی سند کے ساتھ امام ابو حنیفہ سے یہ قول نقل کرتے ہیں کہ ان سے جب ایک عورت نے یہ سوال کیا ہے کہ آپ جس 'الٰہ' کی عبادت کرتے ہیں، وہ کہاں ہے؟ تو امام صاحب نے اس عورت کو جواب نہ دیا اور سات دن تک اس کے سوال کا جواب دینے سے رُکے رہے، یہاں تک کہ سات دن بعد امام صاحب تشریف لائے اور اپنی دو کتابیں [غالباً مراد فقہ اکبر اور فقہ ابسط ہے] سامنے رکھیں اور کہا:

الله تبارك وتعالىٰ في السماء دون الأرض. فقال له رجل : أرأيت قول الله عز وجل:﴿وَهُوَ مَعَكُمْ﴾ قال: هو كما تكتب إلىٰ الرجل إني معك وأنت غائب عنه[1]

''اللہ تعالیٰ آسمان میں ہے اور زمین میں نہیں۔ ایک شخص نے اس پر کہا کہ قرآن کی اس آیت کہ ﴿وَهُوَ مَعَكُمْ﴾ سیعنی وہ اللہ تمہارے ساتھ ہے، کے بارے آپ کی کیا رائے ہے تو امام صاحب نے کہا: یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ تو کسی آدمی کو کوئی خط لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں، حالانکہ تو اس سے غائب ہوتا ہے۔''

1 الاسماء والصفات : ۳۳۸/۲، مکتبہ السوادی، جدہ

اب اس کو مولانا سلیم اللہ خان صاحب یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ تفویض مطلق ہے؟ اور استوا کا اس قدر معنیٰ بیان کرنا ہی تفویض کہلاتا ہے۔ اگر تو مولانا کی تفویض سے یہی مراد ہے جو امام ابو حنیفہ کے حوالے سے مذکورہ بالا عبارت میں بیان ہوئی ہے تو پھر ان کے اور سلفیہ کے مابین اختلاف لفظی ہے۔ یعنی استوا سے مراد آسمان میں ہونا لینا کیا تفویض مطلق ہے یا لفظ کو حقیقی معنی پر برقرار رکھ کر اس کی کیفیت بیان کرنے سے اجتناب کرنا ہے؟

⑬ امام ابو حنیفہ سے جب اللہ تعالیٰ کے آسمان دنیا پر نازل ہونے کے بارے سوال ہوا تو اُنہوں نے جواباً کہا: ینزل بلا کیف[1]

''اللہ تعالیٰ نازل ہوتے ہیں لیکن اس کی کیفیت بیان نہیں ہوگی۔''

⑭ مشہور حنفی فقیہ شمس الائمہ امام سرخسی (متوفی ۴۳۸ھ) محکم اور متشابہ کی بحث میں قرآن میں تشابہ کا معنی سمجھاتے ہوئے لکھتے ہیں:

وبيان ما ذكرنا من معنى المتشابه من مسائل الأصول أن رؤية الله بالأبصار في الآخرة حق معلوم ثابت بالنص، وهو قوله تعالىٰ ﴿وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۚ وَوُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ بَاسِرَةٌ﴾ ثم هو موجود بصفة الكمال، وفي كونه مرئيا لنفسه ولغيره معنًى الكمال إلا أن الجهة ممتنع، فإن الله تعالىٰ لا جهة له فكان متشابها فيما يرجع إلى كيفية الرؤية والجهة، مع كون أصل الرؤية ثابتًا بالنص معلومًا كرامة للمؤمنين، فإنهم أهل لهذه الكرامة، والتشابه فيما يرجع إلىٰ الوصف لا يقدح في العلم بالأصل ولا يبطل، وكذلك الوجه واليد على نص الله تعالىٰ في القرآن معلوم وكيفيـــة ذلك من المتشابه فلا يبطل به الأصل المعلوم. والمعتزلـة ــ خذلهم الله ــ لاشتباه الكيفية عليهم أنكروا الأصل فكانوا بإنكارهم صفات الله تعالىٰ وأهل السنة والجماعة ــ نصرهم الله ــ أثبتوا ما

1 شرح الفقہ الاکبر از علی قاری: ص ۱۲۶، دار البشائر الاسلامیہ، بیروت؛ شرح العقیدۃ الطحاویۃ از ابو العز حنفی: ص ۲۱۸، الاسماء والصفات از بیہقی: ۲/ ۳۸۰

هو الأصل المعلوم بالنص وتوقفوا فيما هو المتشابه وهو الكيفية ولم يجوزوا الاشتغال بطلب ذلك[1]

''اعتقادی مسائل میں متشابہ کا جو معنی ہم نے بیان کیا ہے، وہ یہ ہے کہ آخرت میں آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا دیدار نص سے معلوم، حق اور ثابت ہے جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ کچھ چہرے اس دن تروتازہ ہوں گے اور اپنے ربّ کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔ پھر وہ صفتِ کمال کے ساتھ موجود بھی ہے اور اللہ کے اپنی ذات اور دوسروں کے لیے دیکھنے جانے سے مراد کمال درجے میں دیکھا جانا ہے مگر اس دیکھنے میں کوئی خاص جہت نہیں ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ جہات سے پاک ہے۔ پس اس صورت میں متشابہ سے مراد یہ ہے کہ اللہ کو دیکھے جانے کی کیفیت اور جہت متشابہ ہے [نہ کہ دیکھنا یعنی رؤیت کا حقیقی معنی ہی متشابہ ہے] جبکہ دیکھنا تو نص سے معلوم اور ثابت ہے اور اس میں اہل ایمان کی فضیلت ہے۔ اور تشابہ [یعنی متشابہ ہونا] یہاں پر رؤیت کی کیفیت میں ہے اور ایسے تشابہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ رؤیت کا حقیقی واصلی معنی ہی باطل یا قابل عیب ٹھہرے۔ اس طرح کا معاملہ صفتِ 'ید' اور صفت 'وجہ' کا بھی ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں قرآن میں بیان کیا ہے تو اُن کا معنی معلوم ہے لیکن ان کی کیفیات متشابہ ہیں۔ پس کیفیت کے متشابہ ہونے کی وجہ سے حقیقی و اصلی معنٰی باطل قرار نہیں پائے گا۔ جہاں تک معتزلہ کا تعلق ہے، اللہ اُنہیں رسوا کرے، اُنہوں نے صفات کی کیفیت کے مشتبہ ہو جانے کی وجہ سے ان کے حقیقی معنی کا بھی انکار کر دیا پس وہ اللہ کی صفات کے منکر بن گئے۔ جبکہ اہل سنت والجماعت، اللہ تعالیٰ ان کی مدد ونصرت فرمائے، صفات کی نصوص کے حقیقی واصلی معنی کا اثبات کرتے ہیں اور ان صفات میں جو چیز متشابہ ہے اس میں توقف کرتے ہیں اور وہ متشابہ چیز ان کی کیفیت ہے اور اس کیفیت کے پیچھے پڑنے کو اہل سنت جائز قرار نہیں دیتے ہیں۔''

یہ واضح رہے کہ سلفی حنفی علما اللہ تعالیٰ کے لیے جہات کا انکار کرتے ہیں لیکن صفتِ علو یا فوقیت کو ثابت کرتے ہیں جیسا کہ 'فقہ اکبر' اور عقیدہ طحاویہ اور شرح عقیدہ طحاویہ میں ہے:

⑮ امام بزدوی بھی متشابہ کے بارے مشائخ حنفیہ کا مسلک بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

إثبات اليد والوجه حق عندنا معلوم بأصله متشابه بوصفه ولا

1 أصول السرخسی: ص ۱۷۰، دار الکتاب العلمیہ، بیروت

يجوز إبطال الأصل بالعجز عن إدراك الوصف بالكيف وإنما ضلت المعتزلة من هٰذا الوجه فإنهم ردّوا الأصول لجهلهم بالصفات فصاروا معطلة[1]

"[اللہ کی صفات میں سے] ہاتھ اور چہرہ کا اثبات ہمارے نزدیک حق ہے اور اس کا اصل معنی [یعنی حقیقی معنی] معلوم ہے جبکہ اس کی کیفیت متشابہ ہے۔ پس صفات کے اصل [یعنی حقیقی] معنی کو اس وجہ سے ردّ کرنا جائز نہیں ہے کہ صفات کے اس اصل معنی کی کیفیت کا اِدراک ممکن نہیں ہے۔ معتزلہ اسی وجہ سے گمراہ ہوئے اور اُنہوں نے اپنی جہالت کے سبب صفات کے حقیقی معانی کا بھی انکار کر دیا اور معطلہ بن گئے۔"

⑯ اسی طرح امام طحاوی (متوفی ۳۲۱ھ) لکھتے ہیں:

وأن القرآن كلام الله منه بدأ بلا كيفية قولا[2]

"یہ کہ قرآن اللہ کا کلام ہے، اسی سے اس کی ابتدا باعتبارِ قول کے ہوئی ہے اور اس کی کوئی کیفیت بیان نہیں ہوگی۔"

امام مالک بن انس کا عقیدہ

امام مالک (متوفی ۱۷۹ھ) کا بھی صفاتِ باری تعالیٰ میں وہی عقیدہ ہے جو امام ابو حنیفہ کا ہے۔ امام بیہقی (متوفی ۴۵۸ھ) اور امام ابن عبد البر مالکی (متوفی ۴۶۳ھ) امام مالک سے اپنی اپنی سند کے ساتھ ان کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

يحيٰى بن يحيٰى يقول: كنا عند مالك بن أنس فجاء رجل فقال: يا أبا عبد الله ﴿اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى﴾ فكيف استوٰى؟ قال: فأطرق مالك برأسه حتى علاه الرحضاء ثم قال: الاستواء غير مجهول، والكيف غير معقول، والإيمان به واجب، والسؤال عنه بدعة، وما أراك إلا مبتدعًا، فأمر به أن يخرج[3]

---

1 اُصولِ بزدوی: ص ۱۰، جاوید پریس، کراچی

2 العقیدۃ الطحاویۃ: ص ۴۵، ۴۴

3 الاسماء والصفات از بیہقی: ۳۰۶/۲، ۳۰۵؛ التمہید از ابن عبد البر: ۱۵۱/۷، مؤسسہ القرطبہ، بیروت

''یحییٰ بن یحییٰ سے روایت ہے کہ ہم حضرت انس بن مالک کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص آیا اور اس نے سوال کیا: اے عبداللہ! اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے اور یہ استواء کس طرح کا ہے؟ [راوی کہتے ہیں کہ] امام مالک نے اپنا سر جھکایا یہاں تک کہ اُنہیں غصے سے پسینہ آگیا۔ پھر اُنہوں نے کہا: استوا مجہول نہیں ہے [یعنی معلوم ہے] اور اس کی کیفیت غیر معقول ہے اور اس پر ایمان رکھنا واجب ہے اور اس کے بارے سوال کرنا بدعت ہے۔ اور میرا گمان یہ ہے کہ تو [یعنی سائل] بدعتی ہے۔ اور امام مالک نے اس سائل کو اپنی مجلس سے نکالنے کا حکم دیا۔''

بنیادی مصادر کی کئی ایک کتب میں امام مالک کا یہ قول کئی اسناد کے ساتھ مروی ہے۔

امام شافعی کا عقیدہ

امام شافعی کا عقیدہ بھی صفات کے بارے وہی ہے جو امام مالک کا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں:

القول في السنة التي أنا عليها، ورأيت عليها الذين رأيتُهم، مثل سفيان ومالك وغيرهما: الإقرار بشهادة أن لا إله إلا الله وأن محمدًا رسول الله وأن الله تعالىٰ على عرشه في سمائه يقرب من خلقه كيف شاء، وأن الله تعالىٰ وينزل إلى السماء الدنيا كيف شاء[1]

''جس طریقہ کار کو میں نے اختیار کیا اور جس منہج پر میں نے امام سفیان ثوری اور امام مالک رحمہما اللہ کو دیکھا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اس کا اقرار کریں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور بلاشبہ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور اللہ تعالیٰ عرش پر آسمان میں ہے اور اپنی مخلوق سے بھی قریب ہوتا ہے، جیسے وہ چاہتا ہے۔ اور آسمان دنیا پر وہ نزول فرماتا ہے جیسے چاہتا ہے۔''

امام شافعی کا یہ قول کئی ایک اور بھی بنیادی مصادر کی کتب میں نقل ہوا ہے۔

---

1 العلو از ذہبی: ص ۱۶۵، مکتبۃ أضواء السلف، الریاض؛ مجموع الفتاوی: ۴/۱۸۱، دار الوفاء، ۱۴۲۶ھ

امام احمد بن حنبل کا عقیدہ

حنبل بن اسحق ، امام احمد بن حنبل (متوفی ۲۴۱ھ) سے نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

نحن نؤمن بأن الله علىٰ العرش،كيف شاء وكما شاء، بلا حد، ولاصفة يبلغها واصف أو يحده أحد، فصفات الله له ومنه، وهو كما وصف نفسه﴿لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ﴾[1]

''ہم اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش پر ہے، جیسے اور جس طرح اس نے چاہا ، بغیر کسی حد کے جسے کوئی بیان کرے، اور بغیر کسی کیفیت کے ، جسے کوئی بتلائے۔ پس اللہ کی صفات اس سے ہیں اور اس کے لیے ہیں، اور اللہ تعالیٰ ایسے ہی ہیں جیسے اُنہوں نے اپنے آپ کو موصوف کیا ہے اور نگاہیں اللہ تعالیٰ کا احاطہ نہیں کر سکتیں۔''

ائمہ اربعہؒ کے عقیدہ کے عقلی و منطقی دلائل

ائمہ اربعہ کے بالمقابل اہل تاویل اور اہل تفویض کا عقیدہ قرآن وسنت کی نصوص کے تو خلاف ہے ہی لیکن عقل و منطق کے بھی خلاف ہے۔ائمہ اربعہ اور سلفیہ ایک بات تو یہ کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے لفظ 'ید' کو اپنے لیے استعمال کیا ہے تو ایک تو اس لفظ میں تاویل مثلاً اس کا مجازی معنی مراد لینا جائز نہیں ہے یعنی یہ کہنا کہ اللہ کے 'ید' سے مراد اس کی قدرت ہے ، کیونکہ یہ کہنا کہ 'ید' کا لفظ عربی میں قدرت کے معنی میں بھی استعمال ہو جاتا ہے، درست نہیں ہے۔

⑰ اس کی وجہ یہ ہے کہ الفاظِ قرآنی سے مراد حقیقت یعنی حقیقی معنی ہو گا اور مجازی معنی اس وقت لیا جائے گا جبکہ اس کا کوئی قرینہ ہو۔ یعنی گفتگو اور خطاب کا یہ ایک مسلم اُصول ہے کہ کلام میں اصل حقیقت ہوتی ہے ، چاہے وہ حقیقتِ لغوی ہو یا عرفی یا شرعی۔ مجازی معنی مراد لینے کے لیے کوئی دلیل چاہیے یعنی کلام میں مجاز مراد لینا دلیل کا متقاضی ہے۔ اگر تو کلام میں مجاز کو اصل مان لیا جائے تو کلام کا معنی کبھی متعین ہی نہیں ہو سکتا کیونکہ

1 درء تعارض العقل والنقل: ۲۵۴/۱، دار الکنوز الأدبیة، الریاض

ہر کسی کا مجاز اپنا ہوگا جیسا کہ اہل تاویل کا اللہ کی صفات کے معانی بیان کرنے میں کبھی بھی اتفاق نہ ہو سکا۔ یعنی جہمیہ، معتزلہ، اشاعرہ اور ماتریدیہ سب صفات کی تاویل کرتے ہیں لیکن ان کی تاویلات بھی باہم مختلف ہوتی ہے اور کسی ایک تاویل پر ان کا اتفاق نہیں ہے جبکہ دوسری طرف ائمہ اربعہ حقیقی معنی مراد لیتے ہیں لہٰذا ان میں اتفاق ہے۔

⑱ دوسری بات یہ ہے کہ ائمہ اربعہ کے نزدیک اس لفظ کا حقیقی معنی [یعنی ہاتھ] مراد نہ لینا بھی صحیح منہج نہیں ہے جسے تفویض کہتے ہیں۔ تفویض سے یہ لازم آتا ہے کہ کلام مخاطب کو سمجھانے کے لیے نہ کی جائے اور جو کلام مخاطب کو سمجھ نہ آئے اسے فصیح اور بلیغ کلام نہیں کہتے۔ یعنی صفات میں تفویض کا عقیدہ مان لینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جب کوئی ہم سے یہ پوچھے کہ ﴿ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ﴾ یا ﴿بَلْ يَدٰهُ مَبْسُوْطَتٰنِ﴾ یا ﴿لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ وغیرہ جیسی قرآنی آیات کے کیا معنی ہیں؟ تو ہم یہ جواب دیں کہ ان آیات کا معنی اللہ ہی کو معلوم ہے، ہمیں اس کا علم نہیں ہے۔ اگر کلام کا معنی ہی واضح نہ ہو تو وہ کلام فصیح و بلیغ کیسے کہلائے گا؟ اللہ کی ذات اس سے بہت منزہ ہے کہ ایسا مبہم کلام کرے جو مخاطب کو سمجھ ہی نہ آئے۔ بلکہ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ تو یہ فرماتے ہیں:

﴿اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ﴾ (یوسف:۲)

''بلاشبہ ہم نے اسے عربی قرآن بنا کر نازل کیا ہے تاکہ تم اسے سمجھو۔''

⑲ تفویض کے خلاف یہ دلیل بھی کافی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے 'ید' کا لفظ استعمال کیا تو اگرچہ اس کی کنہ ہمیں معلوم نہ بھی ہو لیکن یہ تو معلوم ہے کہ 'ید' سے مراد پاؤں، آنکھیں، چہرہ، ذات وغیرہ نہیں ہوتی۔ گویا آپ نے 'ید' کے معانی سے ایک لمبی چوڑی فہرست کو جب خارج کر دیا تو 'ید' کا کچھ معنی تو از خود متعین ہو گیا۔ یعنی اگر مفوضہ سے یہ کہا جائے کہ کیا صفتِ 'ید' سے مراد صفتِ 'عین' ہو سکتی ہے تو ان کا جواب کیا ہوگا؟ پس 'ید' کی حقیقت معلوم ہے اور اس سے مراد مجاز نہیں ہے جبکہ اس حقیقت کی کیفیت معلوم نہیں ہے۔

اہل تاویل اور اہل تفویض نے سلفیہ پر یہ جو اعتراض کیا ہے کہ صفات کا حقیقی معنی مراد لینے سے تجسیم لازم آتی ہے تو یہ اعتراض نہایت ہی بودا ہے۔ اہل تاویل کے لیے تو اس اعتراض

کا جواب یہ ہے کہ جن اہل تاویل نے اللہ تعالیٰ کے لیے صفتِ وجود کا اثبات کیا ہے اور اس کا حقیقی معنی مراد لیا ہے۔ پس جب وہ اہل تاویل صفت وجود حقیقی معنی پر باقی رکھتے ہیں اور اس کی تاویل نہیں کرتے جبکہ دیگر صفات کی وہ تاویل کرتے ہیں۔ لہٰذا وہ جو موقف صفت وجود کے لیے اختیار کرتے ہیں وہی دیگر صفات کے لیے بھی کرنا پڑے گا۔

جہاں تک اہل تفویض کا معاملہ ہے تو ان سے ہمارا سوال یہ ہے کہ وہ اللہ کی صفتِ وجود [یعنی موجود ہونا] میں بھی تفویض کے قائل ہیں یا نہیں؟ اگر تو وہ صفتِ وجود میں بھی تفویض کے قائل ہیں تو دہریت لازم آتی ہے یعنی صفتِ وجود میں تفویض کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ وجود کا معنی کیا ہے اور اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ہم اللہ کے وجود (Existence of God) یعنی ہونے اور نہ ہونے کا معاملہ بھی اللہ کے سپرد کر دیں اور یہی دہریت ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم نہ تو اللہ کے وجود کا انکار کرتے ہیں اور نہ ہی اقرار کرتے ہیں۔ اگر تو اہل تفویض صفتِ وجود کا حقیقی معنی مراد لیتے ہیں تو ان پر بھی تجسیم کا اعتراض لازم آتا ہے کیونکہ وجود تو کسی شے کا ہوتا ہے اور معدوم کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔

خلاصۂ کلام: ائمہ اربعہ کا عقیدہ توحید اسماء وصفات میں یہ ہے کہ وہ حقیقی معنی کا اثبات کرتے ہیں اور اس معنیٰ کی کیفیت کے پیچھے نہیں پڑتے۔ حنفی ماتریدی، حنفی اشعری اور حنفی اہل تفویض کا عقیدہ ائمہ اربعہ اور امام ابو حنیفہ کے عقیدے کے خلاف ہے اور اگر اہل سنت والجماعت سے مراد ائمہ اربعہ کا عقیدہ ہے تو توحیدِ اسماء وصفات کے پہلو سے ماتریدی، اشعری اور مفوضہ حنفی علماء اہل السنہ والجماعہ سے خارج ہیں۔ پس برصغیر کے بریلوی علما اور علماے دیوبند، جیسا کہ ان کے عقیدے کی نشاندہی مولانا سلیم اللہ خان صاحب نے کی، اس لحاظ سے اہل سنت والجماعت سے خارج ہیں کہ وہ ائمہ اربعہ کے متفقہ عقیدہ پر نہیں ہیں۔

البتہ یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہر حنفی اہل السنہ سے خارج نہیں بلکہ حنفیہ میں جو امام ابو حنیفہؒ کے عقیدہ پر ہیں جیسا کہ امام ابو یوسف، امام محمد، امام طحاوی، امام بزدوی، امام سرخسی، امام ابن ابی العز حنفی اور مولانا عبدالحیی لکھنویؒ وغیرہ تو وہ بلاشبہ اہل سنت والجماعت میں داخل ہیں۔ برصغیر کے احناف کو بھی امام ابو حنیفہ کی طرح خالص سلفی عقیدہ کو اپنانا چاہئے۔ باقی رہا

اہل تاویل اور اہل تفویض کا اُخروی معاملہ تو ہم اس کے بارے کوئی کلام نہیں کرتے، کیونکہ یہ معاملہ جنتی اور جہنمی ہونے کا اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے کسی فرشتہ مقرب اور نبی مرسل کو بھی اس کا اختیار نہیں دیا۔ ہم ظاہر کے مطابق کسی عقیدہ یا فقہ کے مسلک کو صحیح یا غلط، راجح یا مرجوح تو کہہ سکتے ہیں۔ اسکے آگے ہمیں حق نہیں ہے۔ واللہ اعلم بالصواب!

اہل سنت (ائمہ اربعہ وغیرہ) یا سلفی قرآنِ کریم کو لفظاً و معنیٰ اللہ کی کلام کہتے ہیں، اس طرح احادیث قرآن کریم کی تشریح و تفسیر ہیں (جنہیں مرادِ الٰہی بھی کہا جاسکتا ہے) لہٰذا اسماء وصفاتِ الٰہی کے مسئلہ میں ان کو تعبیر کی پریشانی نہیں ہے۔ وہ نہ صرف اللہ تعالیٰ کی صفاتِ ذاتیہ (نفس، ید، ساق وغیرہ) کو لفظاً اور معنیً بلا تعطیل و تکییف مانتے ہیں بلکہ دوسرے اسماء وصفات کو بھی اسی طرح بلا تاویل تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے بالمقابل اہل تاویل کا موقف یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ اہل تاویل (جہمیہ، معتزلہ، اشعریہ، ماتریدیہ) قرآنِ کریم کے لیے اللہ تعالیٰ کی کلامِ لفظی ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ اگرچہ جہمیہ اور معتزلہ تو خلق قرآن کے قائل ہیں جب کہ اشعریہ اور ماتریدیہ صراحۃً تو قرآن کو مخلوق نہیں کہتے بلکہ اسے کلامِ نفسی کہتے ہیں۔ تاہم قرآنِ کریم کے الفاظ (سب اہل تاویل کے نزدیک) اللہ تعالیٰ کی کلامِ لفظی نہ ہونے کی بنا پر، اس میں وارد اسماء وصفاتِ الٰہی کے بارے میں الفاظ کی حد تک، مسئلہ میں کوئی زیادہ فرق نہیں رہ جاتا۔

دوسری طرف احادیث کے اخبارِ صحابہؓ ہونے کی بنا پر ان میں الفاظ کی بجائے اصل مفہوم ہی ہوتا ہے۔ گویا کتاب وسنت میں وارد الفاظ کے اطلاقات کا مسئلہ تو اہمیت کھو بیٹھا۔ اب مسئلہ صرف مفہوم کا رہ گیا ہے۔ جہمیہ تو اسماءِ الٰہی (متکلم، سمیع، بصیر) کے منکر ہیں اور معتزلہ اسماءِ الٰہی کے الفاظ کی بجائے ان کے مفاہیم کی تاویل کر کے اُنہیں مجاز کی بحث میں لے گئے ہیں۔ البتہ صفاتِ الٰہی (کلام، سمع، بصر) کے معتزلہ منکر ہیں، لیکن اشعریہ اور ماتریدیہ صفاتِ الٰہی (کلام، سمع، بصر) کا صراحۃً انکار تو نہیں کرتے تاہم مفہوم کی وہ بھی تاویل کر کے اسے مجاز ہی قرار دیتے ہیں۔ گویا متکلمین کی تعبیرات متنوع ہیں جن کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں۔ ہم نے بہت اختصار سے ایک خلاصہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ (محدث)

عید میلاد النبی ﷺ: اِسراف وتبذیر

شورش کاشمیری

غلغلہ اسراف کا خیر البشرؐ کے نام پر
میں سمجھتا ہوں نئی اُفتاد ہے اسلام پر

جھنڈیوں کے جھرمٹوں میں قمقموں کا پیچ وتاب
زاویے بُنتی ہوئیں رعنائیاں ہر گام پر

یار لوگوں میں نئے عنوان سے چندے کی طلب
حیف اس انداز پر، افسوس ان ایام پر

مسجد نبویؐ کی نقلیں کوچہ و بازار میں
دیدہ و دل نقش بر دیوار ہیں اصنام پر

بج رہے ہیں ڈھول، تماشے، تالیاں، چمٹے، رباب
کس مزے سے عید میلاد النبیؐ کے نام پر

دینِ قیم سرنگوں نالہ بلب روحِ حجاز
مفتیانِ دین بازاری کے ذوقِ خام پر

کٹ کھنوں کے ہاتھ میں میرِ اُمم کا تذکرہ
عرشِ اعظم کانپتا ہے اس مذاقِ عام پر

اینڈے پھرتے ہیں، شورش واعظِ بے لگام
کھینچ کر تنسیخ کا خط شرع کے احکام پر

تحقیق و تنقید

فاروق رفیع

کیا نبی اکرم ﷺ کی نمازِ جنازہ ہوئی تھی؟

آج کل شیعہ حضرات کی طرف سے یہ سوال بہ کثرت پوچھا جاتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا جنازہ کس نے پڑھایا تھا؟ اس سوال سے دراصل یہ ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے کہ صحابہ کرام بالخصوص صدیق وفاروق رضوان اللہ علیہم اجمعین کو معاذاللہ خلافت کے لالچ میں آپ کے جنازہ کی بھی فکر نہ تھی۔ آپ ﷺ کی وفات صحابہ کرام کے لئے اس قدر اندوہ ناک تھی کہ بہت سے صحابہ کو اس کا کسی طور یقین نہ آتا تھا۔ وفات کے شدید دکھ کے پیش نظر یہ پہلو اسلامی لٹریچر میں کبھی تفصیل یا رغبت سے زیر بحث نہیں آتا۔ بہر طور اس الزام اور شبہ کے ازالہ کے لئے اور دفاعِ صحابہ کی غرض سے درج ذیل مضمون پیش خدمت ہے۔ ح م

نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ کا اہتمام کیا یا نہیں؟ پھر آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ باجماعت ادا کی گئی یا منفرد؟ اگر وہ منفرد جنازہ تھا تو بعد ازاں آپ ﷺ کی نماز جنازہ باجماعت ادا کیوں نہ کی گئی؟ یہ مختلف اعتراضات واشکالات ہیں جن کا ذیل میں دلائل صحیحہ اور اقوالِ صریحہ سے موازنہ پیش کیا جائے گا اور آخر میں صحیح دلائل کی رو سے راجح موقف کی نشاندہی کی جائے گی۔ ان شاءاللہ

پہلا اِشکال: کیا نبی کی نمازِ جنازہ پڑھی گئی تھی؟

نبی ﷺ کی مسنون نماز جنازہ پڑھی گئی یا آپ ﷺ کے لئے محض دعا ہی کرائی گئی۔ اس تاریخی امر کے بارے علماے کرام میں اختلاف ہے۔ امام نووی بیان کرتے ہیں:

''آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ کا اہتمام ہوا یا آپ ﷺ کے لئے دعا کی گئی، اس بارے ایک سے

زیادہ موقف پائے جاتے ہیں۔ بعض علما کا قول ہے کہ آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ سرے سے کسی نے پڑھی ہی نہیں بلکہ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین گروہ در گروہ حجرہ مبارک میں داخل ہوتے اور آپ ﷺ کے لئے دعا کرکے واپس پلٹ آتے تھے۔ پھر ان علما نے آپ کی مسنون نمازِ جنازہ نہ پڑھنے کی دو علتیں بیان کی ہیں:

① آپ ﷺ کی فضیلت و عظمت کے پیش نظر آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ نہ ادا کی گئی، کیونکہ آپ ﷺ کو اس (نمازِ جنازہ) کی ضرورت نہ تھی۔ لیکن یہ قول درست نہیں، کیونکہ آپ ﷺ کو غسل دیا گیا، جب کہ آپ غسل کے عمل سے بھی مستغنی تھے۔ چنانچہ جب آپ کے جسدِ اطہر کو دیگر فوت شدگان کی طرح غسل دیا گیا تو نمازِ جنازہ پڑھنے میں بھی چنداں حرج نہ تھا۔

② بعض علما کہتے ہیں کہ آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ کا اس لئے اہتمام نہ ہوسکا کیونکہ اس وقت کوئی امام نہ تھا۔ یہ قول بھی باطل ہے، کیونکہ فرض نمازوں کی امامت کی ادائیگی معطل نہ ہوئی تھی اور ابو بکر صدیق آپ کی تدفین سے قبل ہی خلیفہ نامزد ہو چکے تھے۔''[1]

شرح نووی میں بعض علما کا بیان کردہ یہ موقف کہ آپ ﷺ کی نماز جنازہ پڑھی ہی نہیں گئی، تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے، بلکہ صحیح احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ کی مسنون نمازِ جنازہ کا اہتمام کیا گیا تھا اور محض رسمی دعا پر ہی اکتفا نہ ہوا تھا جیسا کہ درج ذیل حدیث میں اس کی صراحت موجود ہے، ابو عسیب یا ابو عسیم بیان کرتے ہیں:

أنه شهد الصلاة على رسول الله ﷺ قالوا: كيف نصلي عليه؟ قالوا: ادخلوا أرسالا أرسالا قال: فكانوا يدخلون من هذا الباب فيصلون عليه، ثم يخرجون من الباب الآخر[2]

''وہ نبی ﷺ کی نمازِ جنازہ میں حاضر ہوئے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ (باجماعت یا منفرد) کیسے پڑھیں؟ اس پر صحابہ کرام نے (باہمی

---

① المنہاج شرح صحیح مسلم از امام نووی: 36/7

② مسند احمد: 18/5، الطبقات الکبریٰ لابن سعد: 289/2

مشاورت سے) کہا: تم (آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ میں) ٹولیوں کی شکل میں شامل ہو جاؤ۔ چنانچہ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین ایک دروازے سے داخل ہوتے اور آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ پڑھتے، پھر دوسرے دروازے سے نکل جاتے تھے۔''

یہ حدیث اس امر کی صریح دلیل ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے نبی ﷺ کی مسنون نمازِ جنازہ پڑھی تھی، محض دعا پر ہی اکتفانہ کیا تھا۔ چنانچہ اس قول کو راجح قرار دیتے ہوئے امام نووی تحریر کرتے ہیں:

والصحيح الذي عليه الجمهور أنهم صلوا عليه فرادٰى، فكان يدخل فوج يصلون فرادٰى، ثم يخرجون ثم يدخل فوج آخر فيصلون كذلك

اس بارے راجح اور مبنی برحق موقف جمہور علماء کا ہے کہ اُنہوں (صحابہ) نے آپ ﷺ کی انفرادی نماز جنازہ پڑھی تھی (محض دعا پر اکتفانہ کیا تھا)۔ چنانچہ ایک جماعت حجرہ شریف میں داخل ہوتی تو وہ انفرادی نمازِ جنازہ پڑھ کر باہر آجاتی، پھر دوسرا گروہ داخل ہوتا اور اس طرح ازخود نمازِ جنازہ کا اہتمام کرتا۔ ①

دوسرا اِشکال: آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ کا باجماعت اہتمام ہوا یا انفرادی؟

نبی اکرم ﷺ کی نمازِ جنازہ کے متعلق علما کا دوسرا اختلاف یہ ہے کہ آپ ﷺ کی نماز جنازہ باجماعت ادا کی گئی یا ہر شخص نے ازخود نمازِ جنازہ کا اہتمام کیا؟

قول اوّل: ابن قصار نے اس مسئلہ میں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ انفرادی طور پر پڑھی یا نماز باجماعت کا اہتمام کیا گیا؟.... علما کا اختلاف بیان کیا ہے، پھر ان کا اس بات میں بھی اختلاف ہے کہ نماز باجماعت کی امامت کس نے کرائی تھی؟ چنانچہ ایک سند سے مروی ہے کہ ''آپ ﷺ کی نماز جنازہ کی امامت کے فرائض سیدنا ابو بکر نے انجام دیے تھے۔'' اس روایت پر جرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر بیان کرتے ہیں کہ یہ روایت ضعیف ہے۔ اس میں حرام نامی راوی ہے جس کی وجہ سے یہ روایت سخت ضعیف ہے اور ابن دحیہ کہتے ہیں: یہ روایت راویوں کے ضعف اور سند میں انقطاع کی وجہ سے قطعی باطل

① شرح النووی: 26/7

ہے۔ ①

آپ ﷺ کی نماز جنازہ کا باجماعت اہتمام ہونے کے بارے میں کوئی صحیح اور مستند روایت نہیں لہٰذا یہ موقف مرجوح اور ناقابل التفات ہے۔

قول ثانی: صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے باہمی مشاورت کے بعد آپ ﷺ کی نماز جنازہ کا انفرادی طور پر اہتمام کیا اور ہر صحابی نے آپ ﷺ کی نماز جنازہ اپنے طور پر ادا کی۔ یہی موقف راجح اور أقرب إلى الصواب ہے۔ اس موقف کی حقانیت کے دلائل حسب ذیل ہیں:

① ابو عسیب کی گذشتہ حدیث جس میں وضاحت ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے باہمی مشاورت سے آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ منفرد پڑھنے کا فیصلہ کیا تھا اور صحابہ جماعت در جماعت حجرۂ مبارک میں داخل ہو کر نماز جنازہ کا از خود اہتمام کرتے تھے۔ ②

② حافظ ابن عبد البر بیان کرتے ہیں:

وأما صلاة الناس عليه أفذاذا يعني على النبي ﷺ فمجمع عليه عند أهل السير، وجماعة أهل النقل لا يختلفون ③

''نبی اکرم ﷺ کی نمازِ جنازہ انفرادی طور پر ادا کی گئی۔ سیرت نگاروں اور اہل نقل کے ہاں یہ مجمع علیہ اور متفقہ مسئلہ ہے جس پر ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔''

③ امام شافعیؒ نقل کرتے ہیں:

صلى الناس على رسول الله ﷺ أفرادا لا يؤمهم أحد ④

''لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی نمازِ جنازہ اکیلے اکیلے ادا کی۔ کسی نے بھی اُنہیں باجماعت نماز کی امامت نہ کرائی۔''

---

① نیل الاوطار: 47/4

② مسند احمد: 81/5، طبقات ابن سعد: 289/2

③ التمہید: 397/4

④ کتاب الأم: 314/1

④ ابن دحیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں:

والصحیح أن المسلمین صلوا علیه أفرادا لا یؤمهم أحد[1]

''راجح اور درست بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے آپ ﷺ کی فرداً فرداً نمازِ جنازہ پڑھی اور کسی بھی شخص نے نمازِ باجماعت کی امامت کے فرائض ادا نہ کئے۔''

امام نووی نے بھی اسی قول کو راجح قرار دیا ہے۔[2]

تیسرا اِشکال: نبی ﷺ کی نمازِ جنازہ باجماعت کیوں نہ پڑھی گئی؟

صحابہ کرام نے نبی اکرم ﷺ کی نمازِ جنازہ کا باجماعت اہتمام کیوں نہ کیا اور وہ کون سے عوامل و اسباب تھے جن کی وجہ سے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے انفرادی طور پر آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ پڑھنے کو فوقیت دی؟ اس بارے علما کے کئی اقوال ہیں جنہیں درج کرنے کے بعد راجح قول کی نشاندہی کی جائے گی۔

پہلا سبب: آپ ﷺ نے اسی کی ہدایت کی تھی

ابوالقاسم عبدالرحمٰن بن عبداللہ بن احمد سہیلی آپ ﷺ کے انفرادی نمازِ جنازہ پڑھے جانے کی یہ علت بیان کرتے ہیں:

وهذاخصوص به ﷺ ولا یکون هذا الفعل إلا عن توقیف وکذلك روي أنه أوصٰی بذلك[3]

''یہ (انفرادی نمازِ جنازہ پڑھنا) آپ ﷺ کا خاصہ ہے۔ اور یہ فعل کسی توقیفی (منزل من اللہ) حکم کے بغیر روبہ عمل نہیں ہو سکتا تھا۔ نیز یہ بھی مروی ہے کہ آپ ﷺ نے اس بات کا (صحابہ کرام کو) پابند کیا تھا۔''

جہاں تک انفرادی نمازِ جنازہ کا اہتمام کے نبی ﷺ کا خاصہ ہونے کی بات ہے تو کتاب و سنت میں کوئی ایسی ٹھوس دلیل موجود نہیں اور ایسی روایات جس میں نبی ﷺ نے صحابہ کرام

---

① نیل الاوطار: 47/4

② شرح النووی: 36/7

③ الروض الانف: 595/7، 594

کو حکم دیا تھا کہ وہ آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ اکیلے اکیلے ادا کریں، انتہائی ضعیف اور ناقابل حجت ہیں۔ ذیل میں ہم ایسی روایات اور ان کا حکم بیان کریں گے:

① سیدنا علی نے آپ ﷺ سے عرض کیا:

يا رسول الله ﷺ ! إذا أنت قُبضتَ فمن يغسلك، وفيم نكفّنك، ومن يصلى عليك، ومن يدخل القبر؟ فقال النبي ﷺ: يا علي! أما الغسل فاغسلني أنت، والفضل بن عباس يصب عليك الماء وجبريل عليه السلام ثالثكما، فإذا أنتم فرغتم من غسلي فكفنوني في ثلاثة أثواب جدد، وجبريل عليه السلام يأتني بحنوط من الجنة، فإذا أنتم وضعتموني على السرير فضعوني في المسجد واخرجوا عني،فإن أوّل من يصلى علي الرب عز وجلّ من فوق عرشه ثم جبريل عليه السلام ثم ميكائيل ثم إسرافيل عليهما السلام ثم الملائكة زمرًا زمرًا، ثم ادخلوا فقوموا صفوفًا لا يتقدم علي أحد[1]

''یارسول اللہ ﷺ! جب آپ ﷺ فوت ہوں گے تو آپ ﷺ کو غسل کون دے گا؟ ہم آپ ﷺ کو کفن کس میں دیں گے، آپ کی نماز جنازہ کون پڑھائے گا اور آپ کو قبر میں کون اُتارے گا؟ اس پر نبی ﷺ نے فرمایا: اے علی! غسل تو مجھے تم دینا، فضل بن عباس مجھ پر پانی بہائیں گے اور جبرئیل علیہ السلام تمہارے تیسرے ساتھی ہوں گے۔ سو جب تم میرے غسل سے فارغ ہو جاؤ تو مجھے تین نئے کپڑوں میں کفنانا اور جبرئیل علیہ السلام میرے لئے جنت سے حنوط (خوشبو) لائیں گے اور تم مجھے چارپائی میں رکھو تو مجھے مسجد میں رکھ کر مجھ سے پرے ہٹ جانا۔ چنانچہ سب سے پہلے جو میری نمازِ جنازہ پڑھیں گے، وہ ربّ تعالیٰ عرش کے اوپر سے (میری نمازِ جنازہ) پڑھیں گے۔ پھر جبرئیل بعد ازاں میکائیل، اس کے بعد اسرافیل پھر تمام فرشتے جماعت در جماعت میری نمازِ جنازہ پڑھیں گے۔ پھر تم حجرہ میں داخل ہونا اور صفوں میں کھڑے ہونا، کوئی بھی میرا پیش امام نہ بنے۔''

---

① معجم طبرانی کبیر: 2676 یہ حدیث موضوع ہے، کیونکہ اسکی سند میں عبدالمنعم بن ادریس بن سنان کذاب اور اس کا باپ ادریس بن سنان ضعیف راوی ہیں۔ دیکھیے: مجمع الزوائد: 130/9

② سیدنا عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں:

لما ثقل رسول الله ﷺ، قلنا: من يصلي عليك يا رسول الله ﷺ؟ فبكى وبكينا وقال مهلا: غفر الله لكم وجزاكم عن نبيكم خيرًا، إذا غسلتموني وحنطتموني وكفنتموني فضعوني على شفير قبرى، ثم اخرجوا عني ساعة، فإن أوّل من يصلي علي خليلي وجليسي جبريل وميكائيل، ثم إسرافيل، ثم ملك الموت مع جنود من الملائكة، ثم ليبدأ بالصلاة على رجال أهل بيتي، ثم نساؤهم، ثم ادخلوا أفواجًا أفواجًا وفرادٰى[1]

''جب رسول اللہ ﷺ کی بیماری شدت اختیار کر گئی تو ہم نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! آپ کی نمازِ جنازہ کون پڑھائے گا؟ اس پر آپ ﷺ رو دیئے اور ہم بھی اشک بار ہو گئے۔ پھر کچھ دیر بعد آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ تمہاری مغفرت فرمائے اور تمہارے نبی کی طرف سے تمہیں جزائے خیر دے۔ جب تم مجھے غسل دے لو، مجھے کافور لگالو اور مجھے کفن دے دو تو مجھے میری قبر کے کنارے رکھ دینا، پھر کچھ دیر کے لئے مجھ سے دور ہو جانا، چنانچہ سب سے پہلے میری نمازِ جنازہ میرے خلیل و ہم نشین جبرئیل و میکائیل پڑھیں گے، پھر اسرافیل، ازاں بعد ملک الموت فرشتوں کے لشکروں سمیت میری نماز جنازہ پڑھیں گے۔ پھر میری نمازِ جنازہ کا آغاز میرے اہل بیت کے فرد، ان کے بعد اہل بیت کی عورتیں کریں۔ پھر تم گروہ در گروہ اور تنہا تنہا داخل ہونا (اور نماز ادا کرنا)۔''

نیز اس معنی کی تمام روایات جن میں وضاحت ہے کہ نبی ﷺ نے صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کو فرداً فرداً نماز جنازہ پڑھنے کا حکم دیا تھا، ضعیف اور ناقابل حجت ہیں۔ امام شوکانی اس مفہوم کی تمام روایات پر ان الفاظ میں تبصرہ کرتے ہیں:

وأما ما روي أن صلاتهم عليه فرادٰى كان بوصية منه ﷺ فلم يصح في

---

① مستدرک حاکم: 62/3، حلیۃ الاولیاء لابی نعیم: 169/1، 168... یہ روایت سخت ضعیف ہے، کیونکہ اس میں سلام بن سلیمان مدائنی اور عبدالملک بن عبدالرحمن منکر الحدیث ہیں جبکہ اشعث بن خلیق ضعیف راوی ہیں۔ دیکھیے: السلسلة الضعيفة: 6445

ذلك شيء[1]

''اور وہ روایات جن میں منقول ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین نے آپ ﷺ کی انفرادی طور پر نمازِ جنازہ آپ کے حکم کے پیش نظر ادا کی تھی، ایسی کوئی بھی روایت پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتی۔''

دوسرا سبب: خلیفہ کے تعین کا خدشہ

نبی ﷺ کی باجماعت نمازِ جنازہ کا اہتمام نہ کرنے کا دوسرا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ چونکہ ابھی خلیفہ کی نامزدگی عمل میں نہ آئی تھی لہٰذا خدشہ تھا کہ جو شخص آپ ﷺ کی نماز جنازہ کی امامت کرائے گا تو وہ اس عمل سے ہمیشہ کے لئے امام و خلیفہ مقرر ہو جائے گا۔ چنانچہ

① امام رملیؒ بیان کرتے ہیں:

لأنه لم يكن قد تعين إمام يؤم القوم، فلو تقدم واحد في الصلاة لصار مقدما في كل شيء وتعين للخلافة[2]

''آپ ﷺ کی باجماعت نمازِ جنازہ اس لئے نہ پڑھی جا سکی کہ ابھی ایسا امام و خلیفہ متعین نہ ہوا تھا جو لوگوں کو امامت کراتا۔ اور اگر کوئی نمازِ جنازہ میں آگے ہوتا تو وہ تمام اُمور میں امام ہو جاتا تھا اور خلافت کے لئے نامزد ہو جاتا۔''

② صحیح مسلم کی شرح المنہاج میں بھی یہ سبب مذکور ہے کہ ''آپ کی باجماعت نمازِ جنازہ کا اہتمام اس لئے نہ ہو سکا کہ اس وقت کوئی امام مقرر نہ ہوا تھا۔''[3]

آپ ﷺ کی باجماعت نمازِ جنازہ کے عدمِ اہتمام کی یہ علت و سبب غیر معتمد اور ناقابل اعتبار ہے، کیونکہ اس دوران نمازِ پنجگانہ کی امامت کی پابندی ہو رہی تھی اور ان نمازوں کے لئے امام بھی مقرر تھا۔ پھر آپ ﷺ کی نماز جنازہ سے قبل ہی سیدنا ابو بکر صدیق خلیفہ نامزد ہو چکے تھے۔ امام نووی اس علت کو باطل اور غیر مؤثر قرار دیتے ہوئے کہتے ہیں:

---

① السیل الجرار: 216/1
② نہایۃ المحتاج: 482/2
③ شرح النووی: 36/7

وهٰذا غلط، فإن إمامة الفرائض لم تتعطل، ولأن بيعة أبي بكر كانت قبل دفنه، وكان إمام الناس قبل الدفن[1]

''آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ باجماعت نہ پڑھنے کا یہ عذر کہ اس وقت کوئی امام مقرر نہ تھا، یہ دعویٰ باطل ہے، کیونکہ فرض نمازوں کی امامت کا عمل بحال تھا اور اس لئے بھی یہ دعویٰ باطل ہے کہ ابو بکرؓ کی بیعت آپ ﷺ کی تدفین سے پہلے ہو چکی تھی اور وہ اس سے پہلے خلیفہ بھی نامزد ہو چکے تھے۔''

تیسرا اور راجح سبب: براہِ راست اجر وثواب کا کامل حصول

صحابہ کرام کے نبی ﷺ کی انفراداً نماز جنازہ پڑھنے کا تیسرا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپ ﷺ کے احترام وفضیلت کی وجہ اور تمام صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین کی اس شدید خواہش اور لگن کی وجہ سے کہ وہ تمام انفراداً نمازِ جنازہ پڑھ کر برکت حاصل کریں، بایں طور کہ ان کا کوئی پیش امام نہ ہو اور ان کے اور نبی ﷺ کے درمیان کوئی تیسرا فرد حائل نہ ہو تاکہ ان کے اجر وثواب اور برکت کے حصول میں کمی واقع نہ ہو۔ یہ وہ محرکات تھے جن کی وجہ سے صحابہ کرام اجمعین آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ انفرادی طور پر پڑھنے کے لئے متفق ہوئے تھے۔ اس سبب کے دلائل حسبِ ذیل ہیں:

① امام شافعیؒ بیان کرتے ہیں:

صلى الناس على رسول الله ﷺ أفرادًا ولا يؤمهم أحد، وذلك لعظم أمر رسول ﷺ وتنافسهم في أن لا يتولى الإمامة في الصلاة عليه واحد[2]

''لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کی نمازِ جنازہ فرداً فرداً پڑھی اور کسی بھی شخص نے اُنہیں نماز باجماعت کی امامت نہ کرائی، کیونکہ ایک تو آپ ﷺ کی عظمت واحترام ملحوظ تھا، دوسرا صحابہ کرام کا اس اجر وثواب میں ہم سری کا جذبہ موجزن تھا کہ آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ کی امامت کا کوئی ایک شخص مستحق نہ ٹھہرے۔ (بلکہ وہ تمام لوگ اس اجر وثواب میں برابر کے

---

① شرح النووی: 36/7

② کتاب الأم: 314/1

شریک ٹھہریں)

نوٹ: رسول اللہ کے جنازے کے حوالے سے 'احترام وعظمت والے' قول کی تائید شیعہ کتب میں موجود اس روایت سے بھی ہوتی ہے:

فلما فرغ أمير المؤمنين عليه السلام من غسله وتجهيزه تقدم فصلى عليه وحده ولم يشتركه معه أحد في الصلاة عليه وكان المسلمون في المسجد يخوضون فيمن يؤمهم في الصلاة عليه وأين يدفن؟ فخرج إليهم أمير المؤمنين عليه السلام فقال لهم: إن رسول الله ﷺ إمامنا حيًا وميتًا فيدخل إليه فوج بعد فوج منكم فيصلون عليه بغير إمام وينصرفون، وإن الله تعالى لم يقبض نبيًا في مكان إلا وقد ارتضاه لرمسه فيه وإني دافنه في حجرته التي قبض فيها فسلم القوم لذلك ورضوا به[1]

''جب امیر المؤمنین (سیدنا علی) آپ کے غسل اور تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے تو اُنہوں نے آگے بڑھ کر تن تنہا آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ کا اہتمام کیا اور اس میں کوئی دوسرا فرد ان کے ساتھ شریک نماز نہ ہوا۔ جب کہ دیگر مسلمان اس مسئلہ میں کہ آپ کی نمازِ جنازہ کی امامت کون کرائے اور آپ کی تدفین کس جگہ ہو؟ سوچ وبچار میں مبتلا تھے، پھر امیر المؤمنین ان کے پاس تشریف لائے اور ارشاد کیا: بلاشبہ رسول اللہ زندہ اور مردہ (دونوں حالتوں میں) ہمارے امام وپیش رو ہیں، لہٰذا تم گروہ در گروہ (حجرہ شریف میں) داخل ہو کر امام کے بغیر (انفرادی طور پر) آپ کی نمازِ جنازہ پڑھو اور واپس آتے جاؤ اور اللہ تعالیٰ نے نبی کو جس جگہ موت سے دوچار کیا ہے، اس نے آپ کی تدفین کے لیے اسی جگہ کو پسند کیا ہے۔ اس لیے میں آپ کو جہاں آپ کی روح قبض ہوئی ہے، حجرہ میں اسی جگہ دفنانے والا ہوں۔ چنانچہ ان کی رائے کو تمام حاضرین نے تسلیم وقبول کر لیا۔''

② امام قرطبیؒ لکھتے ہیں:

أرادوا أن يأخذ كل أحد بركته مخصوصًا دون أن يكون فيها تابعًا

---

① مرأة العقول فی شرح أخبار آل الرسول از ملا مجلسی:265/5، منہاج البراعة فی شرح منہج البلاغة، ص19

لغیرہ①

"(صحابہ کرام رضوان اللہ اجمعین آپ ﷺ کی نمازِ باجماعت کے اس لئے قائل نہ ہوئے کہ)اُن میں سے ہر شخص آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ کی برکت خاص کو بایں صورت حاصل کرنا چاہتا تھا کہ کوئی شخص اس برکت میں کسی دوسرے کا تابع نہ بنے (بلکہ وہ تمام اس اجر وثواب اور برکت کے برابر مستحق ٹھہریں)۔

کیا صحابیاتِ کرام بھی آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ میں شریک ہوئی تھیں؟

وہ روایات جن میں آتا ہے کہ مرد حضرات کے بعد عورتوں نے بھی اِنفراداً آپ ﷺ کی نماز جنازہ کا اہتمام کیا تھا، وہ تمام روایات ناقابل احتجاج ہیں اور اس بارے کوئی صحیح و مستند روایت موجود نہیں جس میں عورتوں کا نبی ﷺ کی نمازِ جنازہ پڑھنا ثابت ہو۔ اس نوع کی کچھ روایات گزر چکی ہیں اور عورتوں کے آپ ﷺ کی نمازِ جنازہ پڑھنے کی عبد اللہ بن عباس سے مروی روایت بھی ضعیف ہے، جس میں آپ کی طرف یہ قول منسوب کیا گیا ہے:

فلما فرغوا من جهازه يوم الثلاثاء وضع على سريره في بيته ثم دخل الناس على رسول الله ﷺ أرسالًا، يصلون عليه. حتى إذا فرغوا أدخلوا النساء، حتى إذا فرغوا أدخلوا الصبيان، ولم يؤم الناس على رسول الله ﷺ أحد②

"پس جب بروز منگل صحابہ کرام آپ ﷺ کی تجہیز و تکفین سے فارغ ہوئے تو آپ کو آپ کے گھر میں آپ ﷺ کی چارپائی پر رکھا گیا۔ پھر لوگ گروہ در گروہ اندر داخل ہو کر نماز

---

① الجامع لأحکام القرآن: 225/4

② مسند احمد: 292/1، مسند ابو یعلی: 22، سنن ابن ماجہ: 1628، سنن بیہقی: 30/4۔ یہ روایت ضعیف ہے کیونکہ اس کی سند میں حسین بن عبد اللہ بن عبید اللہ ہاشمی ضعیف راوی ہے اور اس پر علمائے جرح و تعدیل نے سخت جرح کی ہے جیسا کہ یحییٰ بن معین نے کہا: ضعیف ہے۔ امام احمدؒ کا قول ہے کہ اس کی احادیث منکر ہیں اور امام بخاری کہتے ہیں کہ اس کے بارے علی بن مدینی کا قول ہے کہ میں نے اس کی احادیث چھوڑ دی ہیں۔ ابو زرعہ کہتے ہیں کہ یہ کمزور راوی ہے اور امام نسائی نے اسے متروک کہا ہے۔ (میزان الاعتدال: 537/1)

پڑھنا شروع ہوئے۔ حتیٰ کہ جب مرد حضرات فارغ ہو چکے تو اُنہوں نے عورتوں کو اندر بھیجا اور جب وہ (نماز سے) فارغ ہوئیں تو بچوں کو بھیجا اور لوگوں کو رسول اللہ ﷺ کی نمازِ جنازہ کی امامت کسی شخص نے نہ کرائی۔

کیا نبی اکرم ﷺ کے جسدِ اطہر کو صحابہ کرام نے یکسر نظر انداز کر دیا تھا؟

شیعہ حضرات کی طرف سے بڑا واویلا کیا جاتا ہے کہ وفاتِ نبی ﷺ کے بعد صحابہ کرام نے نبی ﷺ کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا اور وہ اس المیے کو بھول کر حصولِ خلافت کی دوڑ میں لگ گئے تھے۔ ان اعتراضات کے پس منظر میں رافضیوں کا صحابہ کرام سے دلی عداوت اور بغض و کینہ پنہاں ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ نہ تو صحابہ کرام اجمعین کے دلوں میں آپ ﷺ کی وفات کا غم زائل ہوا تھا اور نہ ہی وہ اس سانحہ سے خلافت کے شوق میں اور اقتدار پر قبضہ حاصل کرنے کے لئے بے تاب تھے۔

ہوا یوں کہ انصاری صحابہ نے ایک نجی مجلس میں یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ دین کے لئے ہماری خدمات لاتعداد ہیں اور دین کی ترویج و ترقی اور استحکام میں ہمارا مرکزی کردار رہا ہے لہٰذا نبی ﷺ کی جانشینی کے اصل مستحق ہم ہیں۔ اس لئے خلیفہ کی نامزدگی ہمارے قبیلہ سے ہونی چاہئے۔ اس سوچ کے پیچھے بھی کوئی اقتدار کی ہوس یا حکومت چھیننے کے عزائم پنہاں نہ تھے، بلکہ اس فکر کے پیچھے بھی دین کے استحکام اور ترویج کا جذبہ ہی کارفرما تھا۔ قبیلہ انصار کی سقیفہ بنو ساعدہ میں یہ مجلس ہو رہی تھی اور اس دوران ابو بکر و عمر اور دیگر مہاجرین صحابہ مسجد نبوی ہی میں آپ ﷺ کی جسدِ اطہر کے قریب موجود تھے اور ابو بکر و عمر کو قبیلہ انصار کی اس منصوبہ بندی کا علم بھی مسجدِ نبوی ہی میں ہوا تھا۔

چنانچہ سیدنا ابو بکرؓ و عمرؓ انصارِ صحابہ کی اس مشاورت کے متعلق سن کر سقیفہ بنو ساعدہ میں خلافت کے حصول اور حکومت پر قبضہ جمانے کے سلسلہ میں نہیں گئے تھے بلکہ سقیفہ بنو ساعدہ میں پہنچنے کے پیچھے بھی نبی ﷺ کے احکامات کی تعمیل کرانے کا جذبہ کارفرما تھا، کیونکہ نبی ﷺ اپنی وفات سے قبل یہ حقیقت عیاں کر چکے تھے کہ خلافت قریش کا حق ہے اور خلیفہ قریشی ہی ہوگا۔ چنانچہ سقیفہ بنو ساعدہ میں پہنچ کر سیدنا ابو بکر صدیق نے قبیلہ انصار کو نبی ﷺ کا یہ

فرمان سنایا کہ خلیفہ کا قریشی ہونا نبوی حکم ہے۔ اس حدیث کا سننا تھا کہ تمام انصاری صحابہ فرمانِ نبوی ﷺ سن کر حق خلافت سے دستبردار ہوگئے اور قریشی خلیفہ کی نامزدگی کے قائل ہوگئے تھے۔ پھر ابو بکر و عمر بھی خلافت و امارت کے دل دادہ نہیں تھے بلکہ ابو بکر نے تو عمر اور ابو عبیدہ بن جراح کے نام تجویز کئے تھے کہ ان میں سے کسی ایک کو خلیفہ نامزد کرلو، لیکن عمر نے جلدی سے سیدنا ابو بکر کا ہاتھ بڑھا کر ان کی بیعت کی اور دیگر حاضرین مجلس کو بھی ترغیب دی جس پر تمام حاضرین بیعت کے لئے اُمڈ پڑے۔ یوں خلافت کا مشکل مرحلہ باتفاق نمٹ گیا اور اس قضیے کے بعد تمام صحابہ کرام مسجدِ نبوی میں حاضر ہوئے اور حضور سید الانس والجن کے جسدِ مبارک کے قریب ہی رات بسر کی۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین!

اگلے روز منگل کا دن بھی لوگوں کا خلیفہ کی بیعت کرنے میں گزرا اور نبی ﷺ کی تجہیز و تکفین کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ یوں صحابہ کرام کی دانش مندی اور معاملہ فہمی کی وجہ سے خلافت کی خاطر پیش آمدہ تصادم کا خطرہ بھی ٹل گیا اور تجہیز و تکفین اور تدفین کے دوران پیش آنے والے اختلافات کا بھی خاتمہ ہوا کہ تمام معاملات خلیفہ کی زیر سرپرستی بخیر حسن وخوبی انجام پائے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ وفاتِ نبی ﷺ کے بعد صحابہ کرام کا خلیفہ کی نامزدگی کے لئے سرگرم ہونا اور آپ ﷺ کی تجہیز و تکفین اور تدفین میں تاخیر کی وجہ صحابہ کرام کی نبی ﷺ سے بے رخی اور لاُبالی پن کا نتیجہ نہ تھی بلکہ ان تمام عوامل کے پیچھے نبی ﷺ کی تعلیمات کی تعمیل، دینی استحکام کی فکر اور مستقبل میں مسلم اُمہ کے اتحاد کو قائم رکھنے کی سوچ ہی محرک تھی۔ نیز صحابہ کرام کی ایمان افروز بصیرت اور انتہائی دانشمندی کی وجہ سے مستقبل کے بہت سے فتنے ختم ہوگئے اور اسلامی ترقی کے راستے میں ممکنہ بہت سے خطرات کا از خود خاتمہ ہوگیا۔ پھر صحابہ کرام کی نبی ﷺ سے محبت و مودّت کا تو یہ عالم تھا کہ وہ تادمِ زیست نبی ﷺ کو اپنا محسن و اسحان کیش مانتے رہے اور عمر بھر کبھی بھی نبی ﷺ سے محبت و مودّت کے رشتے میں کبھی تنزل واقع نہیں ہونے دیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں نبی کریم ﷺ کی سچی محبت اور آپ کے اہل بیت عظام اور صحابہ کرام کی مخلصانہ مودت نصیب فرمائے۔ آمین!

نقطہ نظر

ڈاکٹر نعمان ندوی

عہدِ رسالتؐ اور سائنس و ٹیکنالوجی

ترقی سائنس، ارتقا اور معیارِ زندگی کی بلندی کے مفروضات کی تلاش میں سرگرداں ہونے سے قبل اس سوال پر نہایت گہرے غور و فکر کی ضرورت ہے کہ رسول اللہ ﷺ تاریخ کے کس موڑ پر تشریف لائے؟ جب آپؐ دنیا میں آئے تو اس دنیا کا کیا نقشہ تھا؟ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی نبوت کے لیے جس خطے کا انتخاب کیا، اس کی جغرافیائی اہمیت و حیثیت کیا تھی؟

حرمین شریفین کی جغرافیائی اہمیت اور حیثیت

مکہ مکرمہ قدیم اور جدید جغرافیہ دانوں کی تحقیق کے مطابق دنیا کے وسط میں واقع ہے۔ گویا کائنات کی مرکزی ہستی ختمی مرتب ﷺ کو کائنات کے مرکز میں مبعوث کیا گیا، اس بعثت کے ذریعے خانۂ کعبہ کی مرکزیت کو دنیا کے لیے ایک مرتبہ پھر ابد تک قائم کر دیا گیا کہ اب پوری دنیا کو رہتی دنیا تک اس مرکزِ خداوندی اور اس مرکزی ہستی رسالت مآب ﷺ کے ساتھ دائمی تعلق قائم کرنا تھا جو تمام عالمین کے لیے رحمت اور کافۃً للناس ہیں اور آپ ﷺ کا پیغام پوری دنیا کے لیے آخری، حتمی، قطعی اور ابدی پیغام ہے۔

جزیرۃ العرب کی جغرافیائی اہمیت یہ ہے کہ دنیا کے تین برّاعظم اس سے ملتے ہیں۔ حج کی عبادت کے باعث دنیا بھر کے تجارتی قافلے جزیرۃ العرب کے ذریعے اس سرزمین سے، جو نہ صرف مرکز کائنات [Centre of Universe] بلکہ ازل سے ابد تک کے لیے مرکز رُشد و ہدایت بھی ہے؛ تجارت، کاروبار، حج اور اسفار کے ذریعے مسلسل رابطے میں رہتے تھے اور پیغام رسالت مآب ﷺ ان قافلوں کے ذریعے مشرق و مغرب اور شمال و جنوب میں فطری طریقے سے پہنچ سکتا تھا۔ یہ پیغام لے جانے والے پیامِ رسالت ﷺ کی صرف زبانی ترسیل نہ کرتے بلکہ پیغام دینے والے پیامبر کی سیرت اور شخصیت کے گوشوں سے بھی ذاتی

طور پر واقف ہوتے تھے، کیونکہ وہ قرآنِ مجسم رسالت مآب ﷺ کو جزیرۃ العرب کے گرد و غبار، در و دیوار، دیار و اَمصار، کوچہ و بازار اور نقش و نگار میں ایک نورانی و روحانی وجود کے طور پر چلتا پھرتا ہوا پاتے تھے۔ ایک لفظی قرآن تیس سپاروں میں بند تھا اور دوسرا عملی قرآن مکہ کے گلی کوچوں میں شب و روز اُن کے درمیان موجود تھا جس کے ایمان کی حرارت سے پتھر دل پگھل رہے تھے اور صحرا میں موجود ریت کے ذرّوں کو بھی شعور حاصل ہو رہا تھا۔ آپؐ کی سیرت کے گوشے ان کے لیے مہرِ جہاں تاب کی کرنوں کی طرح روشن تھے۔ یہ پیغام رسانی 'عین الیقین' کے درجے میں ہوتی تھی۔

بعثتِ نبویؐ کے وقت قومِ حجاز کی تمدنی حالت

عالم عرب کے ایک جانب یونانی فلسفے، سائنس، منطق، تہذیب و تمدن کے آثار محفوظ تھے تو دوسری جانب ایران، چین، ہند اور روم کی تہذیبیں اپنے علوم و فنون کی پوری آب وتاب کے ساتھ زندہ تھیں۔ فلسفہ، سائنس، ٹیکنالوجی اور علومِ عقلیہ میں جزیرۃ العرب ان اقوام سے مسابقت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جس قوم، بنو اسمٰعیل میں آپؐ تشریف لائے وہ 'اُمیون' تھے۔ صرف اہل کتاب اس خطے میں لکھنے پڑھنے سے واقف تھے۔ اس کے برعکس مدارس اور جامعات کے ذریعے تعلیم یونان، ہند، چین اور ایران کے خطوں میں عام تھی۔ ان خطوں سے متصل ماضی کی مٹی ہوئی تہذیبیں: ہڑپہ، موہنجوداڑو و ٹیکسلا کے آثار بھی اس بات کی یاددہانی کراتے ہیں کہ رسالت مآب ﷺ کو ان کی آمد سے پہلے کی عظیم الشان قوموں اور ان کے عہد میں موجود مخالف تہذیب و تمدن کے علوم عقلیہ [Natural Philosophy, Science & Technology] سے کچھ عطا نہیں کیا گیا۔

چین، ہند، روم، یونان اور ایران کی عمارات کے مقابلے میں مدینۃ النبیؐ میں کوئی ایک عمارت عہدِ رسالت میں تو کیا اس کے بعد بھی ماضی قریب تک تعمیر نہیں کی جا سکی تو آخر کیوں؟ اُنیسویں صدی کے آخر تک مکہ معظمہ میں فراہمیٔ آب و نکاسیٔ فضلات [Water and Drainage System] کا کوئی باقاعدہ نظام موجود نہیں تھا، جبکہ رسالت مآب ﷺ کی آمد سے تین ہزار سال پہلے کی تہذیب موہنجوداڑو میں نکاسی غلاظت کا زبردست

نظام موجود تھا۔ مدینۃ النبیؐ میں اس طرح کی سڑکیں، گلیاں، بازار، مکان، سماعت گاہیں [Auditorium] اور یونیورسٹیاں موجود نہ تھیں جو رسالت مآبﷺ کی آمد سے پہلے موہنجودڑو، ہڑپا، ٹیکسلا، یونان اور روم وغیرہ کی تہذیبوں میں موجود تھیں۔ اتنی عظیم الشان تہذیبوں، قوموں اور تمدنوں کے مقابلے میں جو ہر قسم کے علوم وفنون سے آراستہ تھیں، ایک ایسی ہستی کو کھڑے ہونے کا حکم دیا گیا جو نہ لکھنا جانتی تھی، نہ پڑھنا جانتی تھی:

﴿وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْا مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتٰبٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ﴾ (العنکبوت:48)

''اے نبیﷺ! آپ اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے؛ اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔''

اصل علم وحکمت کیا اور اُمیّت کیا ہے؟

ایسی ہستی کا انتخاب کرنے کی حکمت مالکُ الملک کے سوا کون جان سکتا تھا؟ عرب میں یہودی بھی لکھنے کے فن سے واقف تھے مگر اس فن کی خالق کائنات کی نظر میں کوئی وقعت نہ تھی کہ یہودی اس کتاب کو بھلا چکے تھے جو زندگی کا سرچشمہ تھی لہٰذا اس سرچشمے سے لاتعلقی کے بعد کوئی علم اور کوئی ہنر پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں رکھتا۔ رسالتِ مآبﷺ میں اُمی ہونے کی صفت کو عیب کے بجائے اس ہستی کے حق میں ہنر اور کمال قرار دیا گیا اور قرآن نے 'اُمی' کے لقب سے آپﷺ کو اور آپؐ کی قوم کو خود پکارا۔

یہ پکار، یہ اعلان اس امر کا استعارہ ہے کہ اے اہل عالم! تمہاری نظر میں جہل اور علم کے دائرے، اس کے اُصول و منہاج، پیمانے اور معیارات، اس کے اندازے، اس کو پرکھنے کے تمام طریقے اور اس کی تمام تعریفیں بالکل غلط ہیں۔ تم عظیم الشان عمارتوں، کتابوں، کتب خانوں، اداروں، مدرسوں، فلسفوں، سائنس و منطق کو علم سمجھتے ہو مگر یہ کیسا علم و عقل اور کیسی روشنی ہے کہ تم حقیقتِ کائنات اور مالکِ حقیقی کی معرفت سے محروم ہو۔ وہ علم جو تمہیں حقیقت الحقائق سے وابستہ نہ کر سکے، وہ قیامت تک علم نہیں، جہل ہے۔ علم وہ ہے جو تمہیں اپنے خالق کی معرفت سے آگاہ کرے اور اپنی آخرت سنوارنے کے طریقے بتائے لہٰذا

اصلاً اُمی، رسالت مآب ﷺ نہیں؛ اہل یونان، روم، ہند، چین وایران ہیں جو ہدایت کی روشنی سے محروم ہیں؛ جو اپنے مالک حقیقی کو پہچاننے سے قاصر ہیں۔ جو اس نور سے محروم ہو، اس سے بڑا محروم کون ہو سکتا ہے؟

اُمی ہونے کے باوجود رسالت مآب ﷺ پر علم کس ذریعے سے نازل کیا گیا؟ کیا قلم سے؟ جس کی قسم سورۃ العلق میں کھائی گئی۔ کیا کتاب سے؟ جو اس عہد کے تمام بڑے تمدنوں میں موجود تھی۔ کیا قرطاس سے؟ جو اس عہد کے لوگوں کے لیے اجنبی نہ تھا۔ بلکہ علم آپ ﷺ کے قلبِ اطہر پر نازل کیا گیا کہ یہی قلب علم کا اصل سرچشمہ ہے۔ انبیا اسی قلب کو درست کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں جس میں باطل نقب لگاتا رہتا ہے:

﴿ قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ ﴾ (البقرۃ:97)

''ان سے کہو کہ جبرئیلؑ نے اللہ ہی کے اِذن سے یہ قرآن آپ کے قلب پر نازل کیا ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے رسالت مآب ﷺ کی رسالت کو قیامت تک کے تمام انسانوں کے لیے وسیع فرمادیا اور آپ پر نبوت کا اختتام کردیا۔ آپ کافة للناس ہیں، آپ کی ہستی کو اللہ تعالیٰ نے ابد تک کے انسانوں کی زندگی سنوارنے، ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دینے کے لیے مبعوث فرمایا:

﴿ هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴾ (الجمعۃ:2)

''وہی ہے جس نے ناخواندہ لوگوں میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُنھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور اُنھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت سکھاتا ہے یقیناً یہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔''

ان زمانوں کے لیے جو سائنس و ٹیکنالوجی میں سب سے آگے ہونے کا دعویٰ کریں، قرآن نے واضح کردیا کہ اس رسول کی بعثت ان دوسرے لوگوں کے لیے بھی ہے جو ابھی ان سے نہیں ملے ہیں:

﴿ وَآخَرِينَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوا بِهِمْ ۚ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴾ (الجمعۃ:3)

''اور دوسروں کے لیے بھی انھی میں سے جو اَب تک ان سے نہیں ملے۔''

رسالت مآب ﷺ کو اپنے عہد کے عظیم الشان تمدنوں کے سامنے کھڑا کر کے دنیا کو قیامت تک کے لیے بتا دیا گیا کہ اصل علم و دانش اور روشنی و نور وحی الٰہی اور علومِ نقلیہ سے حاصل ہوتا ہے۔ اس روشنی، نور اور دانش سے محروم معاشرے مادّی طور پر خواہ کتنے ہی عظیم الشان ہوں، وہ تاریک ترین اور جہالت میں غرق ہیں اور اُن کو جہالت سے نکال کر روشنی میں لانا اُمتِ وسط کی بنیادی ذمہ داری ہے، جو صبح قیامت تک برقرار رہے گی۔

رسالت مآب ﷺ کو قرآن نے 'سراجِ منیر' کے نام سے پکارا، اس لیے کہ العلم، الکتاب آجانے کے بعد روشنی اور علم آجاتا ہے اور 'اُمیت' باقی نہیں رہتی۔ لہٰذا قرآن نے اُمی اُن کو کہا جو اپنی قوم کے ایک بے مثال فرد پر روشنی، نور، فرقان، میزان، فصل الخطاب، حکم، لب، ضیا، ذکر، حکمت، خیر کثیر اور العلم نازل ہونے کے باوجود اس سے دانستہ محروم رہے، جو الکتاب کے نزول کے باوجود اس نور سے پھوٹنے والے علم سے بے بہرہ تھے:

﴿ وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴾ (البقرۃ:78)

''ان میں ایک دوسرا گروہ اُمیّوں کا ہے جو کتاب کا تو علم نہیں رکھتے بس اپنے بے بنیاد آرزوؤں اور اُمیدوں کو لیے بیٹھے ہیں اور محض وہم و گمان پر چلے جا رہے ہیں۔''

حقیقی علم کے حامل و عامل ہونے کا نتیجہ دین و دنیا کی سرفرازی ہے!

کتابِ ہدایت سے محرومی اور العلم کے مقابلے میں وہم و گمان کی پیروی اور بے بنیاد اُمیدوں و آرزوؤں کے لیے سرگرمی 'اُمیت' ہے اور اسے ترک کرنا نور، روشنی، برہان، فرقان، عرفان، ایمان، سراج اور چراغ ہے۔ اس روشنی کا نتیجہ وہ عظمت، رعب و دبدبہ، ہیبت و فضیلت اور اعزاز و اکرام ہے جو حامل وحی گروہ کو روئے زمین پر عطا کی جاتی ہے:

﴿ كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ ۭ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا اُنْظُرْ كَيْفَ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰي بَعْضٍ ۭ وَلَلْاٰخِرَةُ اَكْبَرُ دَرَجٰتٍ وَّاَكْبَرُ تَفْضِيْلًا ﴾

(الاسراء:20،21)

''تیرے ربّ کی طرف سے اس کی عطا ہر ایک کو پہنچتی ہے۔ تیرے پروردگار کی بخشش کہیں رکی ہوئی نہیں۔ مگر دیکھ لو کہ دنیا ہی میں ہم نے ایک گروہ کو دوسرے پر کیسی فضیلت دے رکھی ہے اور آخرت میں اس کے درجے اور بھی زیادہ ہوں گے اور اس کی

فضیلت اور بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر ہوگی۔''

اس فضیلت کا ایک اثر قرآن نے یہ بھی بیان کیا کہ اس گروہ کے کردار، اقبال اور گفتار کے باعث اللہ تعالیٰ اہل عالم کے دلوں میں ان کے لیے محبت پیدا فرمادیں گے۔ یہ عزت، محبت، برتری اور فضیلت سائنس و ٹیکنالوجی کی بنیاد پر نہیں، علم صحیح اور اعمالِ صالحہ کے صلے میں عطا ہوگی۔ اس محبت کا سبب ان کی اخلاقی و روحانی ایمانی فضیلت ہوگی اور کچھ نہیں۔ قرآن کے الفاظ میں:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَ تُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴾ (مريم:96، 97)

''یقیناً جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور عمل صالح کر رہے ہیں، عنقریب رحمٰن ان کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔ پس اے نبی ﷺ! اس کلام کو ہم نے آسان کر کے تمہاری زبان میں اس لیے نازل کیا ہے کہ تم پرہیزگاروں کو خوش خبری دے دو۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے ربّ سے اپنی اولاد کے لیے دعا فرماتے ہوئے یہ آرزو کی تھی کہ

﴿ رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَ ارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ ﴾ (إبراهيم:37)

'' اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد اس بے کھیتی کے جنگل میں تیرے حرمت والے گھر کے پاس بسائی ہے۔''

یہ مرتبہ اور فضیلت تاریخ کے کسی بھی دور میں، کسی بھی مرحلے پر اور کسی بھی وقت حاصل کی جاسکتی ہے، لیکن جدیدیت کے زیر اثر عہدِ حاضر کے بعض راسخ العقیدہ مسلمان حلقے بھی اب اس فضیلت کے کچھ زیادہ قائل نہیں رہے ہیں۔ ان کے خیال میں سائنس و ٹیکنالوجی کے بغیر فضیلت کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا اور کم از کم عصر حاضر میں صرف اخلاق اور کردار پیدا کرنے سے کچھ نتیجہ نہیں نکلے گا، بالفاظِ دیگر اُمت کی علمیّت اور مابعد الطبیعیات رفتہ رفتہ تبدیل ہو رہی ہے!!

کسی قوم کے عروج کی ضمانت کیا سائنس و ٹیکنالوجی ہیں؟

تو کیا سائنس و ٹیکنالوجی کا انکار کردیا جائے؟

سوال انکار و اقرار کا نہیں، اُصول کا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی قوم کو اس لیے تباہ نہیں کیا کہ وہ سائنس و ٹیکنالوجی میں پیچھے رہ گئی تھی بلکہ اس لیے تباہ کیا کہ وہ گناہ کی زندگی میں بہت آگے بڑھ گئی تھی اور پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہ تھی اور کسی قوم کو عروج اس لیے عطا نہیں فرمایا کہ وہ سائنس و ٹیکنالوجی میں اپنی مقابل تہذیب سے بڑھ گئی تھی۔ استخلاف فی الارض کو پاکیزگیٔ قلب و نظر سے مشروط کیا گیا ہے، سائنس و ٹیکنالوجی زیادہ سے زیادہ فرضِ کفایہ کے درجے میں ہے، لیکن اب اُمّت صرف اس کے حصول کو واحد فریضۂ دینی تصور کر رہی ہے۔ فرضِ کفایہ نے افضل ترین فرض کا درجہ حاصل کرلیا ہے۔ یہ ہے فکر و نظر میں تبدیلی، کہ فضیلت، برتری، کامیابی اور استخلاف کا واحد سبب محض سائنس و ٹیکنالوجی کو سمجھ لیا گیا ہے۔ پوری اُمّت اسی کی تعلیم و تحصیل کو افضل ترین علم تصور کر رہی ہے، لیکن اس کے باوجود اس کے زوال کی رات مزید گہری ہو رہی ہے۔

اُمید کا مرکز العلم اور الکتاب نہیں بلکہ وہ علم ہوگیا ہے جو مغرب نے تخلیق کیا ہے اور ہم صرف اسی علم کی آرزو سے تبدیلی کی صبح کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ وہ بنیادی تغیر، رویہ اور سوچ ہے جس نے اُمت کے لیے بلندی کے تمام راستے مسدود و محدود کردیئے ہیں۔ قرآن میں عروج و زوال سے متعلق آیات میں ایک آیت بھی ایسی نہیں بتائی جاسکتی جو عروج کو صرف اور صرف سائنس و ٹیکنالوجی کے حصول سے مشروط کرتی ہو، نہ ہی استخلاف کی کسی آیت میں کسی نبی کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ زمین میں اقتدار کے بعد سائنس و ٹیکنالوجی کے علم کی تدریس و تعلیم کو اوّلیت دیں گے۔ ہر جگہ صلوٰۃ، زکوٰۃ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس علم کو جو مرتبہ و مقام دیا گیا ہے، اس مرتبے و مقام سے اُسے ہٹا دیا جائے تو یہ عدل نہیں، ظلم ہے۔ اس ظلم کے اقرار اور اس پر تین سو برس مسلسل اصرار کے باوجود اُمّت کا حال کیا ہے؟ ملائیشیا، ترکی، ایران، سوڈان، مصر اور پاکستان تمام تر دعوؤں کے باوجود نہ دین میں آگے ہیں، نہ دنیا میں بلکہ شکست کی رات مسلسل طویل ہو رہی ہے۔

قرآن حکیم نے عروج وزوال کے قانون میں کہیں سائنس و ٹیکنالوجی کو زوال و عروج کا سبب قرار نہیں دیا۔اسی لیے: ﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ﴾ (الحجرات:13)

''اللہ کے یہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔''

سائنس داں اور ٹیکنالوجسٹ ہونا کوئی عظمت نہیں۔ اسی لیے صحابہ کرامؓ رسالت مآب ﷺ کے ساتھ رکوع و سجود میں اللہ کے فضل کی تلاش کے لیے سر گرداں رہتے تھے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَ الَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَ رِضْوَانًا سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚۛ وَ مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ۚۛ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْـَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِيَغِيْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِيْمًا﴾ (الفتح:29)

'' محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، کافروں پر سخت ہیں۔آپس میں رحم دل ہیں، تو انھیں دیکھے گا کہ رکوع اور سجدے کر رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے فضل اور رضا مندی کی جستجو میں ہیں۔ان کے نشان ان کے چہروں پر سجدوں کے اثر سے ہے ان کی یہی مثال تورات اور انجیل میں ہے۔''

کبھی تسخیر کائنات، تسخیر ارض اور سائنس و ٹیکنالوجی کی تلاش میں اُنہیں سر گرداں نہیں پایا گیا، اسی لیے قرآن نے بتایا کہ گناہِ عظیم پر اصرار کرنے والے جہنم میں ہوں گے:

﴿اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ۚ وَ كَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِيْمِ﴾

'' بے شک یہ لوگ اس سے پہلے بہت نازوں میں پلے ہوئے تھے اور بڑے بڑے گناہوں پر اصرار کرتے تھے۔'' (الواقعة:45،46)

سائنس و ٹیکنالوجی نہ جاننے والوں یا اس میں پیچھے رہ جانے والوں کو قرآن کی کسی ایک آیت میں بھی جہنم کی وعید نہیں سنائی گئی، آخر کیوں؟ حضرت ابراہیم کو ایک ذی علم لڑکے کی پیدائش کا مژدہ سنایا گیا:

﴿فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَ بَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ﴾

(الذاریات:28)

'' پھر تو دل ہی دل میں اُن سے خوفزدہ ہو گئے، انہوں نے کہا: آپ خوف نہ کیجیے۔''

تو اس علم سے مراد سائنس و ٹیکنالوجی کا علم نہیں، خالق کائنات کی معرفت اور آخرت کی حقیقت کا علم مراد تھا۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اللہ نے بچپن میں ہی حکم سے نوازا۔ ﴿ يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ۖ وَ اٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ﴾(مریم:12) جبکہ حکم کی یہ صفت دیگر انبیا کو نبوت کے ساتھ عطا کی گئی۔ یہ حکم کیا سائنس و ٹیکنالوجی تھا؟

اسلامی نظریۂ حیات

کفار و مشرکین کی تباہی کا سبب یہ تھا کہ ان کے سامنے ان کے ربّ کی آیات میں سے جو آیت بھی آتی ہے، یہ اس کی طرف التفات نہیں کرتے:

﴿ وَمَا تَاْتِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ مِّنْ اٰيٰتِ رَبِّهِمْ اِلَّا كَانُوْا عَنْهَا مُعْرِضِيْنَ ﴾(یٰس:46)

ایسے تمام افراد اور تمام قوموں پر اللہ کا عذاب دراصل ان کے گناہوں کے باعث نازل ہوا: ﴿ فَكُلًّا اَخَذْنَا بِذَنْۢبِهٖ ﴾ (العنکبوت:40) اور مؤمنین کی کامیابی کا سبب یہ تھا کہ وہ گناہگار زندگی سے نفرت کرتے تھے، پاکیزہ زندگی بسر کرتے اور اس دنیا کو گناہوں سے پاک کرنے کے لیے ذمے دار بنائے گئے:

﴿ وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا ﴾

''جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسا کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے اور ہو وہ مؤمن تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہوگی۔'' (الاسراء:19)

اللہ اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے:

﴿ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا ۚ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ﴾

(آلِ عمران:30)

''جس دن ہر نفس اپنی کی ہوئی نیکیوں اور برائیوں کو موجود پالے گا، آرزو کرے گا کہ کاش! اس کے اور برائیوں کے درمیان بہت ہی دوری ہوتی، اللہ اُنہیں اپنی ذات سے ڈرا رہا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے۔''

وہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا .....

﴿ اَلَمْ يَاْتِهِمْ نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّ عَادٍ وَّ ثَمُوْدَ ۛ وَ قَوْمِ اِبْرٰهِيْمَ وَ

اَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَ الْمُؤْتَفِكٰتِ ۚ اَتَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَ لٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ (التوبة:70)

''کیا انھیں اپنے سے پہلے لوگوں کی خبریں نہیں پہنچیں: قوم نوح، عاد، ثمود، قوم ابراہیم اور اہل مدین اور موتفکات کی۔ ان کے پاس ان کے پیغمبر دلیل لے کر پہنچے، اللہ ایسا نہ تھا کہ ان پر ظلم کرے بلکہ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر ظلم کیا۔''

اور تمہارا ربّ بخشنے والا اور رحمت کرنے والا ہے۔ اگر وہ ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً پکڑنا چاہتا تو ان پر فوراً عذاب بھیج دیتا: ﴿ فَاَتْبَعَ سَبَبًا ﴾ (الکہف:85)

اسی لیے اس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے لیے لازم کر لیا ہے۔ (الانعام:35)

اس رحمت کے باعث وہ فوراً سزا نہیں دیتا، سورۃ فاطر کی آیت 45 میں ارشاد ہے:

''اگر وہ کہیں لوگوں کو ان کے اعمال کی پاداش میں فوراً پکڑتا تو زمین کی پشت پر ایک جاندار کو بھی نہ چھوڑتا، لیکن وہ ان کو ایک معین مدت تک مہلت دے رہا ہے۔''

لہٰذا وہ انسان کو مہلتِ عمر دیتا ہے کہ وہ عہد اَلست کو یاد کر کے اپنے خالق کی پناہ میں آجائے۔ ''کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی جس میں کوئی سبق لینا چاہتا تو سبق لے سکتا تھا؟'' (فاطر:37) انسان نے وہ قرض ادا نہیں کیا جس کا اللہ نے اسے حکم دیا تھا: ﴿ كَلَّا لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ ﴾ (عبس: 23) یعنی بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے نیکیوں میں سبقت کرنے والے: ﴿ اُولٰٓئِكَ يُسٰرِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ وَ هُمْ لَهَا سٰبِقُوْنَ ﴾ (المؤمنون:61) اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات کے لیے عرصۂ حیات کا تعین اس لیے فرمایا کہ ان کے اندر جو خیر مخفی ہے، اس کو ظاہر ہونے کا موقع عطا فرمائے اور یہ عمر اس خیر کے ظہور میں آنے کے لیے بہت کافی ہے۔ لیکن یہ انسان عہدِ الست کو یاد کرنے کے بجائے ویسی ہی بحثوں میں پڑ گئے جیسی بحثوں میں پچھلی گمراہ قوموں کے لوگ پڑے تھے:

﴿ كَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّ اَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّ اَوْلَادًا ۭ فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَ خُضْتُمْ كَالَّذِيْ خَاضُوْٓا ۭ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴾ (التوبة:69)

”مثل ان لوگوں کی جو تم سے پہلے تھے تم میں سے وہ زیادہ قوت والے تھے اور زیادہ مال واولاد والے تھے۔ پس وہ اپنا دینی حصہ برت گئے پھر تم نے بھی اپنا حصہ برت لیا جیسے تم میں سے پہلے لوگ اپنے حصے سے فائدہ مند ہوئے تھے اور تم نے بھی اس طرح جداگانہ بحث کی جیسے کہ انھوں نے کی تھی ان کے اعمال دنیا اور آخرت میں اکارت ہوئے یہی لوگ نقصان پانے والے ہیں۔“

مؤمنین اس دنیا کو عیش کی بجائے مشقت، آزمائش اور امتحان کی جگہ سمجھتے تھے، کیونکہ انسان کو مشقت میں پیدا کیا گیا ہے۔ (البلد:4) اور عیش صرف جنت میں میسر ہوگا جہاں ہر خواہش پوری ہوگی۔(الفرقان:16) جو کچھ (جنت میں) وہ طلب کریں گے، ان کے لیے حاضر ہے۔(یٰس:57) لہٰذا دنیا میں عیش و عشرت تلاش کرنے کی بجائے مومن اسے جنت کے حصول تک ملتوی کردیتے ہیں اور سادہ زندگی کو اپنے پیغمبرﷺ کی اتباع میں اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیتے ہیں۔ کفار کو جب اقتدار ملتا ہے تو وہ اس زمین کو جنتِ ارضی بنانا چاہتے ہیں۔ان کی دوڑ دھوپ دنیا سے زیادہ سے زیادہ تمتع پر مرکوز رہتی ہے اور مؤمنین استخلاف فی الارض کی نعمت ملنے کے بعد نماز، زکوٰۃ کا نظام قائم کرتے اور معروف کی تلقین و منکر کا خاتمہ کرتے ہیں:

﴿ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَ اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَ نَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴾ (الحج:41)

”یہ وہ لوگ ہیں اگر ہم زمین میں ان کو اقتدار دیں تو یہ پوری پابندی سے نمازیں قائم کریں اور زکوٰتیں دیں اور اچھے کاموں کا حکم کریں اور برے کاموں سے منع کریں۔“

وہ متاعِ دنیا کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھتے۔(الحجر:88) نماز اُنہیں سب سے زیادہ عزیز ہوتی ہے کہ یہ دین کا ستون ہے اور کفر اور اسلام میں حد فاصل ہے۔اس لیے قرآن میں آتا ہے: ﴿ وَ مِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ وَ حَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۙ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ ۗ اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ۚ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَ اخْشَوْنِيْ ۗ وَ لِاُتِمَّ نِعْمَتِيْ عَلَيْكُمْ وَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴾ (البقرۃ:150)

”اور جس جگہ بھی آپ ہوں اپنا منہ مسجد حرام کی طرف پھیر لیں اور جہاں کہیں تم ہو اپنے چہرے اسی طرف کیا کرو تاکہ لوگوں کی کوئی حجت تم پر باقی نہ رہ جائے سوائے ان

لوگوں کے جنہوں نے ان میں سے ظلم کیا ہے۔ تم اُن سے نہ ڈرو، مجھ ہی سے ڈرو تاکہ میں اپنے نعمت تم پر پوری کروں، اس لیے بھی کہ تم راہِ راست پاؤ۔''

یہ آیت کفر و اسلام میں حد کا تعین کرتی ہے۔ ارشاد ہے اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو: ﴿وَ اْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَ اصْطَبِرْ عَلَيْهَا ؕ لَا نَسْـَٔلُكَ رِزْقًا ؕ نَحْنُ نَرْزُقُكَ ؕ وَ الْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى﴾ (طٰہٰ:132) مؤمنین کو تجارت خرید و فروخت اللہ کی یاد، اقامتِ نماز اور ادائے زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی:

﴿رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّ لَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَ اِقَامِ الصَّلٰوةِ وَ اِيْتَآءِ الزَّكٰوةِ ۙ۬ يَخَافُوْنَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيْهِ الْقُلُوْبُ وَ الْاَبْصَارُ﴾ (النور:37)

'' ایسے لوگ جنہیں تجارت اور خرید و فروخت اللہ کے ذکر سے اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ ادا کرنے سے غافل نہیں کرتی، اس دن سے ڈرتے ہیں جس دن بہت سے دل اور آنکھیں اُلٹ پلٹ جائیں گی۔''

نماز کے بغیر ایمان معتبر نہیں ہے، اس لیے سورۂ توبہ میں مشرکین کو چار مہینے کی مہلت دی گئی تو یہ بھی کہا گیا کہ پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کردیں تو اُنہیں چھوڑ دو۔ (آیت:5)

نماز اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور زکوٰۃ اللہ تعالیٰ کے حکم سے اس کی مخلوق کا حق ہے۔ ان دونوں حقوق کے بغیر ایمان قابل قبول نہیں ہے۔ اسی لیے حضرت ابو بکرؓ نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف جنگ کی اور فرمایا کہ اگر یہ اونٹ کی رسّی کے برابر زکوٰۃ دینے سے بھی انکار کریں گے تو ان کے خلاف جنگ ہوگی، اس معاملے میں کوئی رعایت نہیں ہوسکتی !!

دورِ نبوی کا احیا ہی مطلوبِ دین ہے!

رسالت مآب ﷺ کو حکم دیا گیا :

﴿وَ لَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾

''اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ایک ایک خبردار کرنے والا اُٹھا کھڑا کرتے پس اے نبی! کافروں کی بات ہرگز نہ مانیئے اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کیجئے۔'' (الفرقان:51)

ان آیات میں بتادیا گیا کہ قیامت تک کے لیے سرچشمۂ روشنی کے طور پر کل دنیا کے لیے رسالت مآب ﷺ کافی ہیں جس طرح ایک سورج سارے جہاں کے لیے کافی ہوتا ہے۔

لاکھ ستارے ہر طرف ظلمتِ شب جہاں جہاں
اک طلوعِ آفتاب دشت و چمن سحر سحر

اہل کفر سے جہاد کے لیے رسالت مآب ﷺ کو علومِ عقلیہ اور آلاتِ سائنس کے بجائے قرآن دیا گیا اور کہا گیا کہ اس کو لے کر کفار سے زبردست جہاد کرو۔ عہدِ حاضر کا مسلمان اس قرآن کو ایک طرف رکھ کر جہاد کا علمبردار ہے۔ روزِ قیامت اس اُمت سے اللہ تعالیٰ یہ سوال کریں گے کہ اس نے اس ذمہ داری کو کس درجے میں پورا کیا؟

اسی لیے جمعہ کے خطبوں میں دنیا بھر کی مساجد میں یہ حدیث پڑھی جاتی ہے کہ «خير القرون قرني» سب سے بہترین زمانہ عہدِ رسالت کا زمانہ ہے اور سب سے بہترین لوگ السابقون الأولون ہیں۔ جب ہم کہتے ہیں کہ خیر القرون سب سے بہتر زمانہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ خشیت و عبادتِ الٰہی، آخرت کے خوف اور دنیا سے بے رغبتی کے اعتبار سے وہ عہد مثالی و معیاری عہد تھا، جب آخرت غالب تھی اور دنیا غیر اہم۔ کسی دل کو دنیا محبوب و مطلوب نہ تھی، حضرت خالد بن ولیدؓ جیسا سپہ سالار بھی دنیا سے کوئی رغبت نہ رکھتا تھا۔ جب انتقال ہوا تو ترکے میں صرف ایک گھوڑا اور تلوار تھی، وہ بھی اُمت کے لیے وقف فرما دیئے تھے اور اس بات کا رنج تھا کہ شہادت نصیب نہیں ہوئی۔ خیر القرون کا یہی مطلب ہے کہ دنیا غیر اہم اور مری ہوئی بکری سے زیادہ حقیر اور آخرت ہر شے سے زیادہ اہم ہو جائے، اس یقین کے بغیر اُمّت کا عروج ممکن نہیں۔ ان معنوں میں مسلمانوں کے لیے اُمید و آرزو، روشنی و نور، معیار و وقار و اعتبار اور عظمت و شوکت کی ہر راہ ماضی سے پیوستہ ہو کر عہدِ رسالت ﷺ کے مدینۃ النبیؐ سے وابستہ ہو جاتی ہے اور اس اُمت کی ذمہ داری یہ بن جاتی ہے کہ وہ تاریخ کے پہیے کو مسلسل عہدِ رسالت کی طرف موڑنے، خیر القرون سے وابستہ رکھنے اور پیچھے کی طرف بار بار پلٹانے کی کوششوں میں مصروف رہے اور ہر اس حرکت، جدوجہد، کوشش کو ترک کردے جو مارکس، ہیگل اور مغربی فلاسفہ کے کافرانہ فلسفوں کے تحت ارتقا

کے تاریخی سفر کے کفر کو عام کرتی ہے۔ تاریخ کے اس جدلیاتی نظریے کے مطابق ہر اگلا دور پچھلے دور سے بہتر ہوتا ہے اور ہر آنے والی نئی نسل گزر جانے والی نسلوں سے بہتر، زیادہ عاقل و بالغ و وسیع النظر، اَعلم اور زیادہ ترقی یافتہ ہوتی ہے۔

اسلام اور مغربی تہذیب میں امتزاج ناممکن ہے!

اسلامی تہذیب و تاریخ و علمیّت میں اس قسم کے افکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ عہد رسالت سے بہتر زمانہ اور بہتر دور نہ آسکتا ہے، نہ آسکے گا اور اس دور کا احیا، اس کی جدوجہد، اس روشنی کی جستجو اور جدوجہد کی خاطر زندگی وقف کر دینا یہی مطلوبِ دین ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عہدِ رسالت سب زمانوں سے بہتر ہے تو اس اعتراف و اعلان کا کیا مطلب ہے؟ کیا عہدِ رسالت کا طرزِ معاشرت، تہذیب، اندازِ نشست و برخاست، سادگی، جمالیات اور سادہ ترین زندگی اب ہمیشہ کے لیے متروک ہو چکے ہیں یا اس کا احیا ممکن ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارا طرزِ زندگی فرعون کا ہو، اور اس طرزِ زندگی میں خیر القرون کی روحانیت کو داخل کر دیا جائے؟ کیا دنیا کو ترجیح دینے والے نفس، نظامِ زندگی، معیشت، معاشرت تہذیب و ثقافت میں عہدِ رسالت کی روحانیت داخل کی جاسکتی ہے؟

جدید طرزِ زندگی کے اندر اسلام کی روحانیت داخل کرنے کی آرزو محض سادگی کی انتہا ہے لہٰذا جب بھی دنیا پرست طرزِ زندگی دین میں داخل ہوگا اور دین دوسرے دروازے سے رخصت ہونے کے بجائے اس جدید مادی ڈھانچے میں تعمیر و تشکیل کے مرحلے سے گزر کر جدید مادیت کی اسلام کاری کرے گا تو روحانیت اس پیکر مادی سے خود بخود رخصت ہو جائے گی۔ دو مختلف طرزِ زندگی دو مختلف و متضاد مابعد الطبیعیات سے نکلنے والے ادارے، اقدار و روایات، علوم، رویے، اسالیب اور مناہج ایک تہذیب میں نہیں سموئے جاسکتے۔ اس لیے گزشتہ سو برس میں عالم اسلام کے اخلاقی روحانی بحرانوں کا سبب یہی دوئی [Dualism] ہے جس کو جاری رکھنے کی علمی دلیلیں دنیا پرست اہل علم مسلسل دے رہے ہیں۔

نفس پرستی اور نفس کشی کی متضاد روایات ایک ساتھ نہیں چل سکتیں۔ کیا خیر القرون کے عہد کی کیفیات اس دور کی سادگی اور دنیا سے کم سے کم تمتع کی روایت کے بغیر روحانیت کا

منبع کچھ اور بھی ہو سکتا ہے؟

مغرب کی کھوکھلی اور بے چین تہذیب

کیا اس جدید تہذیب و تمدن اور طریقوں کو لفظ بہ لفظ 'ارتقاے زمانہ' کے نام پر اختیار کر لیا جائے جس کے نتیجے میں لوگوں کا زندگی بسر کرنا بلکہ مغرب میں لوگوں کا مرنا بھی ناممکن ہو گیا ہے؟ برطانیہ جیسے ملک میں تدفین کی رسومات پر چار پانچ ہزار پونڈ خرچ ہوتے ہیں لہٰذا اب تدفین کی رسم کے لیے بھی انشورنس متعارف کرایا گیا ہے۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں کینسر جیسی کئی موذی اور مہلک بیماریوں کے جدید علاج نے موت کا حصول بھی مشکل بنا دیا ہے۔ علاج سے مرنے کے لیے لاکھوں روپے کی ضرورت ہے۔ سات ہزار سال کی تاریخ میں سترہ تہذیبوں میں جہاں کبھی خودکشی کی روایت نہیں رہی۔ تاریخ میں پہلی مرتبہ خودکشی جدید طرزِ زندگی کے طور پر عام ہو رہی ہے۔ غربت، معیارِ زندگی کی آرزو، خوابوں سے بھرپور الف لیلوی پر تعیش زندگی، چکاچوند سے معمور، زرق برق خوابناک طرزِ حیات جو صرف میڈیا پر دکھائی دیتا ہے، جدید ایجادات اور اُن کی اشتہار بازی سے بے شمار مہلک دماغی، جسمانی اور روحانی امراض مسابقت کی دوڑ میں ناکامی کے باعث پیدا ہو رہے ہیں۔ ان مہلک امراض کے علاج اتنے مہنگے ہیں کہ زندگی بہ خوشی ہار دینا اور خودکشی کر لینا زیادہ آسان ہو گیا ہے۔ جو موت قسطوں میں لاکھوں روپے خرچ کر کے ملتی ہو، جس کے باعث خاندان، جائیداد، عزتیں اور عورتیں سب بک جاتی ہوں مگر مریض پھر بھی صحت مند نہ ہوتا ہو تو سب کے لیے خودکشی کے راستے کھل جاتے ہیں۔ اسی لئے خودکشی عام ہو رہی ہے خواہ وہ دنیا کے غریب علاقے ہوں یا امیر خطے، اس کا سبب شاعر عارف شفیق نے صرف دو مصرعوں میں بتا دیا ہے: ؏

غریب شہر تو فاقے سے مر گیا، لیکن　　امیر شہر نے ہیرے سے خودکشی کر لی

کسی کے پاس کھانے کو روٹی نہیں اور کسی کے پاس کھا کے مرنے کے لیے ہیرا ہے، یہ خدا بے زار معاشروں کا انجام ہے!!

خودکشی صرف غریب آدمی نہیں کر رہا، بڑے بڑے اُمرا کر رہے ہیں؛ ان یورپی ممالک میں ہو رہی ہے جہاں آمدنی اور عیاشی سب سے زیادہ ہے۔ جن کو ہمارے جدیدیت پسند مسلم

مفکرین بڑی حسرتوں سے دیکھتے ہیں اور جیسے ہی کسی یورپی ملک سے سفر کر کے آتے ہیں، فوراً مدح و ثنا کے لیے سفر نامے لکھتے اور اسلام سے ٹریفک کا نظام ثابت کرنے لگتے ہیں۔ مغرب میں محبت، خاندان، رشتوں، روابط، مذہب، اقدار اور اخلاقیات کی موت کے باعث لوگوں کی زندگی بے معنی [meaningless] ہو چکی ہے۔ اس کو معنی دینے کا طریقہ گینیز بک آف ورلڈ ریکارڈ ہے، مگر زندگی پھر بھی بے معنی ہی رہتی ہے۔ نہ خاندان، نہ ماں، نہ بیوی نہ بچے، آدمی کس کے لیے جیئے؟ کس کے لیے مرے؟ کس کے لیے قربانی دے؟ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ آدمی اپنے ہی لیے مر جائے۔ ہائیڈیگر کے الفاظ میں یہ 'فاتحانہ موت' آج مغرب کی پسندیدہ تہذیب ہے جسے تیزی سے مقبولیت حاصل ہو رہی ہے۔

عہدِ حاضر کا سب سے بڑا فلسفی گلز ڈیلوز [Gills Delluze] اس عہد کے مسائل پر سوچتے سوچتے پاگل ہو گیا اور وہ ان مسائل کا کوئی جواب نہ دے سکا تو اس نے ہسپتال کی کھڑکی سے چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ اسے صدمہ ہے کہ انسان ابھی تک آزاد نہیں ہو سکا۔ باپ بیٹی، ماں اور بیٹے کے رشتوں میں مساوات کے فلسفے کے باوجود ابھی تک احترام قائم ہے۔ یہ تعلقات ابھی تک مکمل ناپاک نہیں ہوئے۔ اسے شکایت یہ ہے کہ [Incestuous Relations] عام کیوں نہیں ہو گئے۔ حالانکہ مغرب میں مساوات کے فلسفے کے باعث حقیقی خونی رشتوں میں جنسی جبر کی شکایات عام ہیں۔ تاریخ انسانی میں کبھی کسی فلسفی نے اس بے بسی کے ساتھ اپنی جان کا نذرانہ پیش نہیں کیا۔ جدید مغربی تہذیب اس کی سائنس، ٹیکنالوجی اور اس کے بطن سے پھوٹنے والے مسائل گلز ڈیلوز کی خودکشی کا سبب ہیں۔

سوئٹزرلینڈ، ناروے، سویڈن، جرمنی اس وقت عصری تاریخ کے ترقی یافتہ، امیر، سہولتوں سے آراستہ اور جدید فتوحات سے مزین بہت محدود آبادی کے حامل معاشرے ہیں۔ لیکن سب سے زیادہ خودکشی کی شرح انہی خطوں میں ہے تو آخر کیوں؟ مادی ترقی کی معراج پر پہنچنے کے بعد بھی کیا کسی شے کی ضرورت باقی رہ گئی؟

انسان خودکشی کیوں کرتا ہے؟ کیا اسے خودکشی کرنی چاہیے؟ خودکشی کیوں کی جاتی ہے؟ فلاسفہ کے یہاں اس پر دلچسپ بحث ملتی ہے۔ کانٹ کے خیال میں انسانی ذہن بارہ حصوں میں

منقسم ہے۔ ہیگل کے خیال میں ان کی تعداد 105 ہے۔ کانٹ کے خیال میں کوئی عقل مند خودکشی نہیں کر سکتا۔ ہیگل کے خیال میں خودکشی انسان ہی کرتے ہیں، جانور کبھی خودکشی نہیں کرتے۔ کیا عہدِ حاضر کا انسان جانور سے بھی گیا گزرا ہے یا خودکشی کوئی قابل فخر کام ہے۔ عہدِ حاضر میں زندگی اتنی اذیت ناک کیوں ہوگئی ہے؟!

زندگی یقیناً اذیت ناک ہے، اس لیے کہ عہد حاضر کے انسان کی آرزوئیں اور تمنائیں میڈیا اور اشتہارات کی صنعت نے بہت بڑھا دی ہیں۔ اس کے نتیجے میں انسان Scarcity کے جدید مادی و روحانی بحران کا شکار ہوگیا ہے جس کا آخری حل خودکشی ہے۔ جزیرۃ العرب کی سخت ترین زندگی میں شب و روز بسر کرنے والے مشرکین نے کبھی خودکشی نہیں کی مگر عہدِ حاضر کے عیش و عشرت اور سہولتوں میں آنکھ کھولنے والے وحشی اپنی جان پر کیوں کھیل رہے ہیں؟ کیا بنیادی تغیر واقع ہوگیا ہے کہ اونٹ کی جلتی ہوئی پیٹھ پر بیٹھ کر تپتے ہوئے صحراؤں میں کوک پیپسی اور ٹیٹراپیک کے دودھ کے بغیر سفر کرنے والا فرد کبھی زندگی سے بیزار نہیں ہوتا تھا، جب کہ عہدِ حاضر کا عیاش فرد یہ تمام سہولتیں، مراعات، تعیشات، مل جانے کے باوجود مر جانا چاہتا ہے تو کیوں؟ اگر عہدِ جدید کے مسلم مفکرین ان باریکیوں، نزاکتوں سے واقف نہیں تو وہ خطبہ جمعہ سننا ترک کردیں اور اپنے لیے ہیگل کے جدلیاتی افکار پر مبنی دَجل سے نیا خطبہ جمعہ تیار کریں۔ [خودکشی کی تفصیلات کے لیے انٹرنیٹ پر بے شمار معلومات میسر ہیں]

سائنس و ٹیکنالوجی کے مدح خواں

حسین نصر اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ ہر تہذیب کو سائنسی ترقی اس قوم کے دورِ زوال میں ملی، لیکن اس تاریخی تجزیے کو تسلیم کرنے کے بعد وہ مسلمانوں کی سائنسی ترقی کے دورِ عروج کو ہی اصلاً دورِ عروج سمجھتے ہیں، اسے زوال کی علامت کے طور پر قبول نہیں کرتے اور اس امر پر تعجب کرتے ہیں کہ اس عروج پر زوال کیوں آگیا؟ اور اس زوال سے عروج کے سفر کا راستہ کیسے نکالا جائے؟ یعنی دنیا کی تاریخ میں تمام تہذیبوں اور اقوام میں مسلمان وہ واحد تہذیب، قوم یا اُمت ہے جس کو سائنسی ترقی دورِ زوال میں نہیں مسلمانوں کے دورِ عروج میں

ملی۔ ایک جانب وہ عہدِ عباسی کو عہدِ ملوکیت بھی قرار دیتے ہیں، ملوکیت کو تمام گناہوں کی جڑ کہتے ہیں تو دوسری جانب اس ملوکیت سے نکلنے والی سائنس کو عظیم اسلامی سرمایہ تسلیم کرتے ہیں اور اس سرمایے کے دوام کے لیے کوشاں رہنے کو مقصودِ قرآن اور مطلوبِ رسالتِ محمدی ﷺ قرار دیتے ہیں۔

ملوکیت کو تمام گناہوں کی جڑ قرار دینا تاریخی طور پر خالص سیاسی مادی اور دور جدید میں خالص مغربی نقطہ نظر سے ہم آہنگ فکر ہے جو جمہوریت اور جدید مغربی تصورِ تاریخ سے برآمد ہوا ہے جس کی عمر تین سو سال سے زیادہ نہیں ہے۔ اسلامی تاریخ کو ملوکیت کی تاریخ سمجھنا ردّ عمل کی نفسیات سے برآمد ہونے والا نتیجہ ہے جو جمہوریت کے کفر سے خاص تعلق رکھتا ہے اور حاکمیتِ جمہور کے ذریعے حاکمیتِ الٰہ کے تصور کو جڑ/بنیاد سے ختم کر دیتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ یہ نقطہ نظر اپنی تاریخ کا انکار ہے۔ جو ملت اپنی تاریخ کو بالکلیہ ردّ کر دے، وہ صحرا میں تنہا کھڑی ہو گی اور سراب کی تلاش میں رہے گی۔

اُمتِ محمدیہ نے سائنسی علوم کی ترویج کو اپنا مطمحِ نظر کیوں نہ بنایا!

حسین نصر کے ان تضادات کی تشریح و توجیہ کے لیے ہمیں کچھ اور لکھنے کی ضرورت نہیں، حسین نصر اور مکتبہ روایت سے وابستہ مفکرین اسلامی سائنس کی نہایت عالمانہ اور پرجوش وکالت کے باوجود یہ نہیں بتا سکے کہ مسلمان کا دورِ عروج تو عہدِ رسالت مآب ﷺ اور عہدِ خلافتِ راشدہ ہے اور بلا شبہ خیر القرون ہے، لیکن اس عظیم عہد اور اس کے بعد خلافتِ راشدہ کے زرّیں ادوار میں سائنس کی ترقی کے لیے کیا لائحۂ عمل مرتب کیا گیا؟ اگر نہیں تو کیوں؟ خیر القرون سائنس کی عظیم ترقی سے کیوں خالی رہا؟ کیا علومِ نقلیہ، روحانیت اور شعورِ ایمانی کے مقابلے میں علوم عقلیہ کی ذرہ برابر بھی وقعت نہیں تھی۔ کبار صحابہ کرامؓ میں کتنے سائنس داں تھے، سائنس کے بغیر ہی مسلمانوں نے تین برّاعظموں کو کیسے فتح کیا؟

اُمتِ مسلمہ کا اصل کردار وہ ہے جب وہ مادی طور پر نہایت ہلکی اور اخلاقی و روحانی طور سے سب پر فضیلت کی حامل تھی یا وہ دور جب اسے دنیا میں مادی طور پر برتری حاصل ہو گئی تھی۔ اگر مادی دور بہتر تھا تو اسی دور میں تاتاریوں جیسی کمزور قوم نے اُنہیں کیسے شکست دے

دی؟اور اندلس عظیم سائنسی ایجادات کے باوجود اپنا تحفظ کیوں نہ کر سکا کہ وہاں کوئی مسلمان باقی نہ بچا؟

یہ سوال اہم ہے کہ ہمسایہ اقوام کی مادّی ترقی، تہذیب، سائنس اور تعمیرات سے اُمّ القریٰ کے مسلمان کیوں مرعوب و متاثر نہ ہوئے؟اور مدینۃ النبیؐ میں ان فنون اور علومِ عقلیہ کی درآمد میں کیا امر مانع رہا؟اس سوال پر بھی غور کی ضرورت ہے کہ مسلمان ہمسایہ اقوام کے علومِ عقلیہ اور محیر العقول فلسفہ و سائنس سے اگر مرعوب ہو جاتے تو کیا وہ روم و ایران کو فتح کر سکتے تھے؟رومی اپنی تمام تر طاقت کے باوجود ایران کو فتح نہ کر سکے، لیکن مسلمانوں نے نہ صرف سرزمین ایران کو فتح کر لیا بلکہ اس خطے کے لوگوں کے قلب بھی تسخیر کر لیے اور عظیم الشان رومی سلطنت کا بھی خاتمہ کر دیا۔ مسلمانوں کے پاس روم و ایران کی سائنس و ٹیکنالوجی کے مقابلے میں صرف ایمان کی قوت تھی۔ان قوتوں کا خاتمہ کرنے والے ان ختم ہونے والی سلطنتوں کی مادی ترقی، علومِ عقلیہ کے مقابلے میں کس حیثیت اور کس مقام کے حامل تھے، اس کے لیے تمام مروّجہ تاریخوں کا مطالعہ کر لیا جائے۔

قرآن اور صاحبِ قرآن پر اعتراضات کی روش

کفارِ مکہ جب ایک اُمی رسول ﷺ کے معجزانہ کلام کے سامنے عاجز رہ گئے تو اُنہوں نے یہ اعتراض کیا تھا:

﴿ وَ قَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا ﴾(الفرقان:5)

''یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں۔''

صرف یہی نہیں بلکہ کفار کو یہ اعتراض تھا کہ یہ کیسا پیغمبر ہے جس کے ساتھ فرشتوں کے لشکر نہیں، جو ہماری طرح بازاروں میں چلتا پھرتا، کھاتا پیتا اور ہم سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اسے علم، مال، دولت، شان و شوکت یعنی مادی طور پر کسی بھی شے میں ہم پر برتری حاصل نہیں۔ یہ مادہ پرست جس چیز کو علم سمجھتے ہیں اور جس منہاجِ علم میں کھڑے تھے، وہاں دنیا اور

اُمورِ دنیا سے متعلق علوم یعنی علومِ عقلیہ اور مال و دولت ہی راس العلم تھا۔ وہ پیغمبر کو عام انسانوں کی طرح عام لوگوں کے ہم رکاب دیکھتے تھے تو اُنہیں حیرت ہوتی تھی۔

ان کا یہ اعتراض بظاہر درست تھا، کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقرب بندوں کو مافوق الفطرت تصور کرتے تھے۔ جنات کے ساتھ انکے تعلق کی نوعیت اور ان کے اکرام کے واقعات جو تاریخ عرب اور کلام عرب ملتے ہیں، اس نقطہ نظر کی تشریح میں معاون ہو سکتے ہیں:

﴿ وَ قَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَ يَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْ لَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَ قَالَ الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴾ (الفرقان:7، 8)

''یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں) کو دھمکاتا؟ یا اور کچھ نہیں تو اس کے لیے کوئی خزانہ ہی اُتار دیا جاتا یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ (اطمینان کی) روزی حاصل کرتا۔ اور ان ظالموں نے کہا کہ تم ایسے آدمی کے پیچھے ہو لیے ہو جس پر جادو کر دیا گیا ہے۔''

﴿ وَ قَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴾ (الفرقان:30)

''اے میرے ربّ! میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانۂ تضحیک بنا لیا تھا۔''

یہ آیت صرف عہدِ رسالتؐ کے کفار مشرکین کے لیے نہیں ہے، اس عہد کے جدیدیت پسند مسلمانوں کے لیے بھی ہے جنہوں نے اس قرآن کی تضحیک کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے ہیں، کبھی کہتے ہیں کہ قرآن کے معنیٰ Hermeneties سے معین ہوں گے، کبھی کہتے ہیں کہ کلام عرب سے اخذ ہوں گے، کبھی کہتے ہیں کہ اس کے جو معنی عہد رسالت میں تھے، اب وہ نہیں ہیں۔

ان میں جو بہت زیادہ جری ہیں ان کو شکوہ ہے کہ اس قرآن کو لے کر ہم کیا کریں، اس میں نہ سائنس ہے، نہ سوشل سائنس، نہ منطق۔ اس کی آیات سے نہ ہم ایٹم بم بنا سکتے ہیں، نہ ہوائی جہاز، یہ قرآن عہدِ حاضر میں کسی کام کا نہیں ہے۔ نعوذ باللہ، دوسری جانب معذرت خواہ سادہ لوح اور جاہل مفکرین اسی قرآن سے تمام مغربی، مادی، عقلی اور سائنسی علوم کو ثابت کر رہے

ہیں۔ مگر اس سوال کا جواب نہیں دیتے کہ عجیب بات ہے کہ قرآن تمہارے پاس تھا اور قرآن میں مستور و مخفی تمام علوم کافروں کو مل گئے جن میں سے کسی ایک سائنس دان نے کبھی بھول کر قرآن نہیں پڑھا اور نہ قرآن کے ذریعے کوئی سائنسی فارمولا دریافت کیا!!

مختصر تبصرہ آزمدیر: سائنس کے بغیر مسلم اُمہ کی ترقی کا خواب کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہوگا! ملتِ اسلامیہ سائنس و ٹیکنالوجی کی طرف رجوع کرکے اپنے زوال کا مداوا کیوں نہیں کرلیتی؟ قرآنِ کریم میں سائنسی علوم کو کیوں موضوعِ بحث نہیں بنایا گیا؟ اس طرح کے خیالات آئے روز ہم سنتے رہتے ہیں، اور اب یہ شکوہ ایک باقاعدہ مکتبِ فکر کی شکل اختیار کرگیا ہے جس کی قیادت حسین نصر اور ان کے ہم خیال لوگ کررہے ہیں۔

زیر نظر مضمون کے فاضل راقم سائنس و ٹیکنالوجی کا انکار کرنے کی بجائے اسے ترقی کا واحد راستہ اور اس کی معراج سمجھنے کے نظریے کے شدید ناقد ہیں۔ ان کے خیال میں اس طرزِ فکر سے اسلام کا اصل مقصود جو اللہ کی معرفت و خشیت، اس کی عبادت، دنیا میں خیر وصلاح کو پھیلانا اور آخرت کی تیاری وغیرہ پس پشت چلے جاتے ہیں۔ الزامی طرزِ استدلال قائم کرتے ہوئے مقالہ نگار استفسار کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے تین براعظموں کو سائنس و ٹیکنالوجی کے بغیر کیوں کر فتح کرلیا؟ خیر القرون کیوں سائنس و ٹیکنالوجی سے 'مزین' نہ ہوسکا؟ صحابہ کرام میں کون سے نامور سائنس دان تھے؟ اللہ تعالیٰ نے دورِ نبوت میں سائنس و ٹیکنالوجی کی موجودگی اور اس دور کے ترقی یافتہ تہذیب و تمدن اور یونیورسٹیوں کے باوجود اپنے محبوب ﷺ کو اس سے کوئی وافر حصہ کیوں عطا نہ کیا؟ اس کے بالمقابل دلوں اور کائنات کو مسخر کرنے والی جو ہدایت اللہ نے اپنی نبی مکرم ﷺ کو دی، وہ بھی ظاہری وسائل علم کے بجائے قلب اطہر پر براہِ راست ہی نازل ہوئی۔ یہ ان کے موقف کا ایک غالب پہلو ہے جو واقعتاً قابل غور ہے!

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام مجرد سائنس کا مخالف نہیں۔ ذاتِ باری تعالیٰ پر اعتقاد واعتماد رکھنے کو شرطِ ایمان ٹھہراتے ہوئے، دنیا کے دارالاسباب ہونے کے تحت اللہ تعالیٰ نے عملی رویہ کے طور پر اُمتِ مسلمہ کو دنیوی اسباب کی جستجو کی تلقین کی ہے۔ بطورِ

مثال جب قرآن کریم ہمیں ﴿واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ﴾ کی ہدایت دیتا ہے تو اس سے مقابلتاً بہتر دنیوی اسباب کے حصول کی جستجو بھی اُمتِ مسلمہ پر عائد ہو جاتی اور دورِ حاضر کے تناظر میں سائنس و ٹیکنالوجی کا حصول واجب ہو جاتا ہے۔ اللہ کی بندگی کو ہی اصل ہدف سمجھ لینا اور اللہ کی عبادات کو انجام دینے پر اکتفا کر لینا ہمارے ملی تحفظ اور فریضۂ ابلاغِ دینی کی ادائیگی کی دنیا میں کافی بنیاد نہیں ہے بلکہ ہمارا دین ہی ہمیں اسباب کے حصول کی بھی تلقین کرتا ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ہم تحفظ کے ان ذرائع و وسائل کو نظر انداز کر دیں۔ یہ بات درست ہے کہ مسلمان کا مطمح نظر اور مقصود و ہدف اللہ کی بندگی اور دنیا میں صلاح و خیر پر عمل پیرا ہونا ہے، تاہم اس دنیا کے دارالاسباب ہونے کے تحت سائنس ایک ضرورت ہے اور اس کا استعمال ضرورت کے ہی درجے میں ہوگا۔

یہ تو سائنس کا وہ استعمال ہے جو اقوام و ملل کے مابین غلبہ کے لئے ضروری ہے، کیونکہ اسلام کو برداشت کرنے کی بجائے سارا کفر مل کر اس کی بیخ کنی پر مجتمع رہا ہے جیسا کہ نصوص سے معلوم ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں سائنس کا ایک مقصد دنیا کو باسہولت و منظم بنانا بھی ہے۔ سائنس کا یہ پہلو دنیوی زینت کے حصول کی جستجو کرتا ہے۔ اس کی بھی اسلام میں ایک حد تک مخالفت نہیں ہے، کیونکہ مسلمان آخرت کی کامیابی کے اصل ہدف کے ساتھ ساتھ دنیا میں بھی زیب و زینت کو اختیار کر سکتا ہے۔ اسلام رہبانیت کا دین نہیں اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں مسلمانوں کو اسلام پر عمل کرنے کی صورت میں حیٰوۃ طیبہ کا وعدہ دیا۔ مسلمانوں کو دین کے ساتھ دنیا کے حسنہ ہونے کی دعا بھی سکھلائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کہا کہ ''کون ہے وہ جو دنیوی زینت کو اللہ کے بندوں پر حرام کرتا ہے؟ دنیا میں یہ زینت مسلمان و کفار دونوں کو ملتی ہے، جبکہ آخرت میں یہ زینت صرف اللہ والوں کے لئے خاص ہے۔''

اگر مقالہ نگار تصوف کی طرف اپنے رجحان کے سبب دنیا سے نفور اور نفس کشی کو اسلام کا مقصد بتا رہے ہیں، تو یہ ایک دوسری انتہا ہے جس کے بالمقابل سائنس و ٹیکنالوجی واقعتاً امر حرام نظر آتی ہے۔ لیکن واضح ہے کہ تصوف کا یہ نظریہ خود اس قابل ہے کہ اس کی اصلاح کی جائے۔ اسلام کا اصل ہدف آخرت کی اصلاح ہے، تاہم دنیا میں مطمئن اور پر سکون زندگی بھی

اسلام کا مقصود ہے اور اشیا کے نظم و نسق کو اسلام پسند کرتا ہے۔

سائنس اپنی اصل کے اعتبار سے اللہ کی پیدا کردہ چیزوں کے نظام اسباب کو جاننے اور ان کو اپنے مقاصد کے لئے بہتر طور پر استعمال کرنے کا نام ہے۔ اس لحاظ سے سائنسی اُصول دراصل الٰہی اُصول ہیں جن کی معرفت / تجربہ کرنے کے نام پر ان کو سائنسی قرار دینے کی غلطی کی جاتی ہے۔ چونکہ فی زمانہ سائنس مغربی اقوام کی کاوشوں کی رہین منت ہے، اس بنا پر یہ 'مغربی سائنس' مغربی مفادات اور فلسفہ کی اسیر ہے۔ اس امر کی ضرورت ہے کہ موجودات کی حقیقت وکنہ کو مغرب کی محکومی سے نکال کر اس حد تک انسانیت کا خادم بنایا جائے جہاں تک ہمارے دین نے اجازت دی ہے۔ الغرض مقالہ نگار کا موقف بالکل درست ہے کہ ترقی کی معراج دراصل اسلام کے نظریاتی و عملی تقاضوں پر علم پیرا ہونا ہی ہے، تاہم سائنس کی کلی نفی کی بجائے اسلامی حدود کے اندر سائنس و ٹیکنالوجی کو فروغ دینا اس دور میں ملتِ اسلامیہ کی جوابی ضرورت ہے، اس کا بھی انکار نہیں کیا جاسکتا! [ڈاکٹر حافظ حسن مدنی]

مکاتیب و مراسلات

قارئین کے تاثرات و تبصرے

① ڈاکٹر حافظ حسن مدنی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ
نہایت ایمان افروز اداریہ لکھنے پر مبارک قبول فرمائیں، اللہ مزید ہمت عطا فرمائے۔
[سلیم منصور خالد، رکن مجلس اِدارت ماہنامہ ’ترجمان القرآن‘]

② جنابِ محترم مدیر صاحب
السلام علیکم! جنوری 2011ء کے محدث میں جناب محمد عطاء اللہ صدیقی کا مقالہ ’قانونِ توہینِ رسالت اور عاصمہ جہانگیر کا کردار‘ نظر سے گزرا۔اس موضوع پر یہ ایک بہترین علمی مقالہ ہے اور مقالہ نویس نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں اور آپ کو جزائے خیر دے۔ میں اپنی رائے کا اظہار اس لیے تاخیر سے کر رہا ہوں کہ جنوری کا شمارہ قدرے تاخیر سے میرے ہاتھ آیا۔ حامد میر کا کالم بھی اچھا تھا۔
خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ والسلام
[رفیع الدین ہاشمی، صدر ادارۂ معارفِ اسلامی، منصورہ]

③ محترم و مکرم جناب ڈاکٹر حافظ حسن مدنی صاحب
سلام و رحمت۔ مزاجِ گرامی؟ آپ کا گراں قدر علمی تحفہ ماہنامہ ’محدث‘ شمارہ فروری 2011ء باصرہ افروز ہوا۔ شکریہ!
① سلمان تاثیر کے قتل سے پیدا ہونے والے سوالات
② توہین رسالت کی سزا، قرآن وحدیث کی نظر میں
③ توہین رسالت کی سزا، بعض اہم سوالات
④ گستاخِ رسول کی سزا اور فقہائے احناف
⑤ اللہ کے ہاں مقدمہ لکھا جاچکا ہے!
⑥ گورنر کا جنازہ، عبرت آموز حقائق

یہ تمام مضامین لائق قدر اور قابل صد تحسین ہیں۔ صاحبانِ قلم نے انتہائی خلوص ومحبت سے اپنے قلبی تاثرات کو قارئین تک پہنچانے کی مساعی فرمائیں۔ ایسے مقالات کی اشاعت وقت کی اہم ضرورت ہے جو آپ بہ احسن وجوہ پوری فرما رہے ہیں۔ اللہ کرے آپ کا یہ مشن ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔ جامعہ نعیمیہ میں آپ کے کلمات سننے کا موقع میسر آیا، ملاقات بھی ہوئی۔ ایسی مجالس سے موافقت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ عزیز القدر مولانا تصدق حسین میرے راشد تلامذہ سے ہیں۔ یہ جامعہ نظامیہ رضویہ کے ممتاز فضلا میں شمار ہوتے ہیں۔ مجموعی طور پر اس شمارہ کے مضامین عمدہ ہیں ایک آدھا مضمون ہی محل نظر ہے۔

باقی حالات لائق صد شکر ہیں۔ رفقائے ادارہ سے سلام مسنون۔ والسلام!

[مولانا محمد منشا تابش قصوری، مدرّس جامعہ نظامیہ رضویہ، لوہاری دروازہ]

④ عزیز محترم ڈاکٹر حافظ حسن مدنی السلام علیکم

'محدث' کا تازہ شمارہ بابت فروری 2011ء پڑھنے کا موقع ملا، شمارے کے تمام مضامین دیکھے اور امر واقعہ ہے کہ ان مضامین کے مطالعے سے ایمان تازہ ہوا۔ بالخصوص آپ کی ادارتی تحریر اور نوید شاہین ایڈوکیٹ کا مضمون پڑھ کر دِلی مسرت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ اور آپ کے رفقا کو یونہی دین کی خدمت کی توفیق مرحمت فرماتا رہے۔ والسلام

[مولانا عبدالمالک مجاہد، دارالسلام پبلشرز، الریاض]

⑤ ناموسِ رسالت پر زوردار اور ایمان افروز اِداریہ لکھنے پر دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ 'محدث' نے اس بار بھی حسبِ سابق دینی صحافت کی بہترین نمائندگی کی۔

[محمد خلیل الرحمٰن قادری، نائب مہتمم جامعہ اسلامیہ، ٹھوکر نیاز بیگ، لاہور]

⑥ محترم جناب ڈاکٹر حافظ حسن مدنی صاحب السلام علیکم ورحمۃ اللہ

محدث، شمارہ دسمبر 2010ء میں آپ کا اداریہ پیش نظر ہے، اس کے حوالے سے عرض ہے کہ "اگر 1986ء تا 2009ء کل 986 کیس سامنے آئے ہیں جن میں سے 479 کا تعلق مسلمانوں سے اور صرف 119 کا تعلق عیسائیوں سے ہے تو باقی 388 کا تعلق کس سے ہے؟ وضاحت فرما کر شکر گزار فرمائیں۔

جنوری 2011ء کے محدث کے مطابق 1986ء تا 2009ء کل 986 کیس سامنے

آئے، لیکن فروری 2011ء کے محدث کے ص9 پر آپ نے تحریر فرمایا ہے کہ ''پاکستان کی تاریخ میں اس قانون کی تاریخ نفاذ 1992ء سے اب تک توہین رسالت کے 986 کیس درج ہوئے ہیں۔'' یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ کل 986 کیس 1986ء تا 2009ء درج ہوئے ہیں یا 1992ء سے اب تک (یعنی جنوری 2011ء تک)؟

روزنامہ 'ایکسپریس' لاہور مؤرخہ 15 جنوری میں کالم نگار عباس اطہر صاحب کے کالم بعنوان 'دنیا ایسی نہیں ہوتی!' میں لکھا ہے:

''1927ء سے لے کر 1986ء تک 295 کا صرف ایک مقدمہ درج ہوا تھا۔ 1986ء سے اب تک 1200 سے زائد مقدمات کا اندراج ہو چکا ہے جن میں سے 1050 سے زائد پنجاب کے حصے میں آئے۔ اب تک 38 افراد قتل ہو چکے ہیں جن میں 15 مسلمان، 16 کرسچن، 5 احمدی اور 2 ہندو ہیں۔ عدالتیں 80 سے زائد ملزموں کو بری کر چکی ہیں۔''

ظاہر ہے کہ آپ کے دیئے ہوئے اور عباس اطہر صاحب کے دیئے ہوئے اعداد و شمار میں بہت فرق ہے۔ براہِ مہربانی اس فرق کی وضاحت فرما کر شکر گزار فرمائیں۔

آپ کا خیر اندیش [محمد اکرم راٹھور، مینیجر بزم طلوعِ اسلام، لاہور]

جوابی وضاحت: مراسلہ نگار نے پہلا سوال یہ کیا ہے کہ 986 میں سے 479 کا تعلق مسلمانوں سے اور 119 کا تعلق عیسائیوں سے تھا تو باقی 388 کیسز کا تعلق کن سے تھا؟

1) آپ کی خدمت میں اعداد و شمار کی مزید وضاحت کے لئے 'نیشنل کمیشن برائے انصاف و امن' کی باقاعدہ رپورٹ کا متعلقہ متن پیش خدمت ہے:

''1986ء سے ۲۰۰۹ء تک اس قانون کے حوالے سے پاکستان میں کل ۹۶۴ مقدمات زیر سماعت آئے جن میں ۴۷۹ کا تعلق مسلمانوں، ۳۴۰ کا احمدیوں سے، ۱۱۹ کا عیسائیوں سے، ۱۴ کا ہندوؤں سے اور ۱۲ کا دیگر مسالک کے پیروکاروں سے تھا۔ ان تمام مقدمات میں سے کسی ایک میں بھی اس قانون کے تحت عملاً کسی کو سزائے موت نہیں دی گئی۔''

2) عباس اطہر کے حوالے سے آپ کا سوال ہے کہ 1927ء سے 1986ء تک 295 کا صرف ایک ہی مقدمہ درج ہوا تھا۔ اب اتنے زیادہ مقدمات کیوں کر ہیں؟

ظاہر ہے کہ جب 295 بی اور سی کا قانون ہی موجود نہ تھا اور عوام الناس اس قانون کا

مطالبہ کررہے تھے، دوسری طرف اس دوران کئی ایک واقعات گواہ ہیں کہ اس عرصہ میں کئی بار اہانتِ رسول کا ارتکاب کیا جاتا رہا تھا، تو معلوم ہوتا ہے کہ عوام توہین رسالت کا مقدمہ قانون نہ ہونے کے سبب یا تو درج نہ کرا سکتے تھے یا قانون پر عدم اعتماد اور اس کے ناکافی کے سبب درج کرانے کو فضول امر سمجھتے تھے۔

3) جہاں تک عباس اطہر اور راقم کے دیے ہوئے اعداد و شمار میں فرق کا تعلق ہے کہ میں نے 986 کیسز [درست تعداد 964] ذکر کئے ہیں اور عباس اطہر نے 1200 سے زائد کیسز کا تذکرہ کیا ہے، دونوں میں فرق کیوں ہے؟

تو راقم کی معلومات کا انحصار پاکستان میں عیسائی حقوق کے لئے کام کرنے والی تنظیم 'نیشنل کمیشن برائے امن وانصاف' کی باضابطہ رپورٹ ہے۔ یاد رہے کہ یہ تنظیم پاکستان کیتھولک چرچ کے پشپ حضرات کے زیر نگرانی 1985ء میں قائم کی گئی اور اقلیتوں کے حقوق کے تحفظ اور ان کو قانونی معاونت مہیا کرنا اس تنظیم کا بنیادی ہدف ہے۔ تنظیم کے بارے مزید تفصیلات انٹرنیٹ پر آپ خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

مسئلہ توہین رسالت کے بارے میں کیسوں کی یہی تعداد حقیقت کے زیادہ قریب ہے، جیسا کہ بی بی سی نے بھی اس تعداد کو 950 کے قریب رپورٹ کیا ہے۔ میرے خیال میں اعداد و شمار میں یہ فرق کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتا، تاہم یہ امر ضرور قابل توجہ ہے کہ کیا پاکستانی عدالتوں نے اس بنا پر کسی ایک مرتکبِ جرم کو قانون کے عین مطابق سزائے موت سنا کر نافذ کی ہے یا نہیں؟ عباس اطہر نے جن 38/افراد کے مقتول ہونے کا ذکر کیا ہے تو واضح رہے کہ یہ عوام کے ماورائے عدالت قتل ہیں۔ یہ امر بہر طور ثابت شدہ ہے کہ دسمبر 2010ء تک 24 سال کے عرصے میں نفاذِ قانون کے بعد کسی کو بھی اس جرم کی بنا پر پاکستان میں سزائے موت نہیں دی گئی۔ اس سے زیادہ اس قانون سازی کے غیر مؤثر ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے؟

معلوم ہوا ہے کہ پاکستانی تاریخ میں پہلی بار جنوری 2011ء کے پہلے ہفتہ میں لاہور ہائیکورٹ کے جسٹس اعجاز احمد چودھری نے توہین رسالت کے ایک مرتکب کی سزائے موت کو کنفرم کیا ہے، لیکن تاحال اپیل اور نفاذ سزا کے مراحل باقی ہیں۔ اگر کسی قانون کو نافذ ہی نہ کیا جائے تو اس کے اثرات معاشرے پر خاک پڑیں گے، بلکہ اُلٹا مجرموں کی حوصلہ افزائی ہو گی، یہی وجہ کہ پاکستان میں اس نوعیت کے جرائم روز افزوں ہیں۔

تعارف وتبصرہ

تعارفِ کتب

نام کتاب: 'برصغیر کا اسلامی اَدب ؛ چند نامور شخصیات'

تصنیف: پروفیسر ڈاکٹر محمد مجیب الرحمٰن بنگالی

ناشر: نقوش، اُردو بازار، لاہور، صفحات: 189، قیمت: 400روپے

تبصرہ نگار: حافظ طاہر الاسلام عسکری

ڈاکٹر مجیب الرحمٰن کا شمار ان اہل علم میں ہوتا ہے جو علومِ قدیم وجدید کی جامعیت سے بہرہ مند ہیں۔ایک طرف وہ 'جامعہ محمدیہ'(اوکاڑہ)اور 'جامعہ سلفیہ' (فیصل آباد) جیسی معروف دینی درسگاہوں سے فارغ التحصیل ہیں تو دوسری طرف یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حامل ہیں۔اسی طرح تدریس کے میدان میں ڈاکٹر صاحب موصوف کو نہ صرف 'جامعہ اہل حدیث' (چوک دالگراں)لاہور میں عربی ادب پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی بلکہ بنگلہ دیش کے 'چپائی نواب گنج کالج' اور 'راج شاہی یونیورسٹی' میں بھی مسندِ درس پر متمکن ہونے کا موقع ملا۔

ڈاکٹر صاحب موصوف معلّم اور محقق ہونے کے علاوہ ایک صاحبِ جذبہ شخصیت ہیں۔ ان کا آبائی وطن بنگال اور مادری زبان بنگلہ ہے،اس لیے اُنھوں نے زیادہ تر بنگلہ زبان ہی میں لکھا ہے اور اب تک محدثین کی حیات وخدمات،تاریخ ادبِ عربی،اعجاز القرآن اور دیگر اسلامی مضامین پر ان کی متعدد کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر منظر عام پر آچکی ہیں۔ڈاکٹر صاحب نے بنگلہ زبان میں قرآنِ کریم کا ترجمہ بھی کیا ہے جو معروف طباعتی ادارے 'دار السلام' (الریاض) کے زیر اہتمام طبع ہوا ہے۔علاوہ ازیں اُنہیں 'تفسیر ابن کثیر' کو بنگلہ زبان میں ڈھالنے کا شرف بھی حاصل ہوا ہے۔یہ حسن اتفاق ہے کہ ان سے قبل قرآن شریف کی اس شہرۂ آفاق تفسیر کو عربی زبان سے اُردو میں منتقل کرنے والے برصغیر کے نامور خطیب اور

عالم دین مولانا محمد صاحب جونا گڑھیؒ تھے جو ڈاکٹر صاحب موصوف کے خسر تھے۔ علامہ قاضی سلیمان منصور پوری کی سیرت پاک پر بے مثال کتاب 'رحمۃ للعالمین ﷺ' بھی ہمارے ممدوح ڈاکٹر صاحب کے قلم حق رقم سے بنگلہ زبان کے قالب میں ڈھل چکی ہے، جو بے شبہ ایک عظیم الشان کارنامہ ہے۔

بنگلہ کے علاوہ ڈاکٹر صاحب نے اُردو زبان میں بھی تحریر و و اِنشا کے جوہر دکھائے ہیں جس کا ایک نمونہ زیر تبصرہ کتاب ہے جو 'برصغیر کا اسلامی ادب: چند نامور شخصیات' کے عنوان سے چھپ کر منصّۂ شہود پر آئی ہے۔ زیر نظر کتاب میں برصغیر کے جن علمی وادبی ہستیوں کا مختصر اور جامع تذکرہ کیا گیا ہے، ان کے اسماے گرامی یہ ہیں:

امام صاغانی لاہوری، علامہ نواب صدیق حسن خان، مولانا محمد جونا گڑھی دہلوی، مولانا محمد اکرم خان، احسن احمد اشک، مولانا محی الدین احمد قصوری، مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی، مولانا صفی الرحمٰن مبارکپوری اور محمد اسحٰق بھٹی؛ مؤخر الذکر کے سوا تمام حضرات دارِ فنا سے دارِ بقا کی طرف کوچ کر چکے ہیں۔

اس کتاب کا 'پیش لفظ' مصنف کے فرزندِ ارجمند پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف صدیق کے قلم سے ہے۔ ڈاکٹر محمد یوسف صدیق بھی اپنے والدِ گرامی کی طرح مصنّف و محقق ہیں اور ادارۂ علوم اسلامیہ، جامعہ پنجاب میں HEC کی طرف سے بطورِ پروفیسر تدریسی و تحقیقی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

کتاب کے آخر میں ایک ضمیمہ بھی ہے جو دہلی کی معروف درس گاہ 'دار الحدیث' کے تاریخی پس منظر اور تعارف پر مشتمل ہے۔ اس درس گاہ کی تاسیس مولانا عبد العزیز محدث رحیم آبادیؒ کی تجویز پر ہوئی۔ 1921ء میں اس مدرسہ کی تعمیر مکمل ہوئی جس پر اس زمانے میں ایک لاکھ روپیہ کی خطیر رقم صرف ہوئی تھی۔ یہاں سے بڑے نامور علما فارغ التحصیل ہوئے۔ اس کا تعلیمی نظام ونصاب محدث روپڑیؒ اور ان کے برادرِ اصغر شیخ التفسیر حافظ محمد حسین روپڑیؒ کے ہاتھ رہا اور امتحانات کی ذمہ داری اوّل تا آخر برصغیر کے علمی خانوادے روپڑی حضرات کے پاس رہی۔ بالآخر تقسیم ہند کے ساتھ ہی اس اعلیٰ درسگاہ کی بندش کا حادثہ فاجعہ پیش آگیا۔

www.mohaddis.com

CPL No. 49
Vol.43 No.3
Monthly MUHADDIS Lahore
5866476
5866396

عناد اور تعصب قوم کے لیے زہرِ ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں

لیکن تعصّبات سے بالاتر رہ کر اِفہام وتفہیم اُمت کے لیے رحمت کا باعث ہے۔

علومِ جدیدہ سے ناواقفیت اور انکارِ انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں

لیکن قدیم علومِ اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔

غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اَقدار کے منافی ہے

لیکن دینِ اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حمیتِ دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔

تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالحِ دینیہ کے خلاف ہے

لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رَواداری برتنا اور قوانین ومسائلِ اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔

آئین وسیاست سے بیگانہ ہو کر عبادت کے لیے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے

لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اَوصاف میں داخل ہے

لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔

اگر آپ ایسا منصفانہ اور معتدلانہ رویہ پسند کرتے ہیں تو

ماہنامہ محدث لاہور

کا مطالعہ فرمایئے، آپ اس کو ان جملہ صفات ومحاسن سے مزین پائیں گے، اِن شاء اللہ! کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

قیمت فی شمارہ ۲۰ روپے ——— زرِسالانہ ۲۰۰ روپے

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL 99-J, Model Town, Lahore 54700